بسم اللہ الرحمن الرحیم

قومی و بین الاقوامی شخصیات کا تذکرہ

"تذکارِ رفتگاں" کے عنوان سے ماہنامہ الشریعہ کی
خصوصی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۷ء کے دو باب
اضافات کے ساتھ

حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : قومی وبین الاقوامی شخصیات کا تذکرہ
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مجموعہ : مئی ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

فہرست

☆ پیش لفظ.....5
☆ شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود شہید.....7
☆ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم.....8
☆ صدر ضیاء الرحمان شہید.....12
☆ چودھری ظہور الٰہی شہید.....14
☆ ارباب سکندر خان خلیل شہید.....15
☆ شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعود مرحوم.....17
☆ الشیخ ابوالنصر البیانویؒ.....18
☆ خان عبدالغفار خان مرحوم.....19
☆ جنرل محمد ضیاء الحق شہید.....20
☆ حافظ بشیر احمد مصری مرحوم.....22
☆ محمد صلاح الدین شہید.....25
☆ محترمہ لیڈی ڈیانا.....26
☆ حکیم محمد سعید شہید.....27
☆ شاہ حسین مرحوم.....31
☆ حضرت مولوی محمد نبی محمدیؒ.....33
☆ ایمل کانسی شہید.....37
☆ ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ.....39
☆ نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم.....42
☆ حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ.....46
☆ یاسر عرفات مرحوم.....55

☆ خان عبدالولی خان مرحوم.....63
☆ عامر چیمہ شہید.....67
☆ مولوی محمد یونس خالصؒ.....75
☆ نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم.....76
☆ صدام حسین مرحوم.....80
☆ محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ.....88
☆ کرنل امیر سلطان تارڑ شہید.....96
☆ اسامہ بن لادن شہید.....99
☆ پیر پگارا سید مردان علی شاہ مرحوم.....107
☆ پروفیسر غفور احمد مرحوم.....110
☆ جناب نیلسن منڈیلا.....113
☆ مجید نظامی مرحوم.....114
☆ شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود مرحوم.....117
☆ سردار محمد عبدالقیوم خان مرحوم.....119
☆ ملا محمد عمر مجاہدؒ.....124
☆ جنرل حمید گل مرحوم.....128
☆ اشتیاق احمد مرحوم.....131
☆ غازی ممتاز قادری شہید.....134
☆ مولانا مطیع الرحمان نظامی شہید.....136
☆ ملا اختر منصور شہید.....138
☆ عبدالستار ایدھی مرحوم.....140
☆ جنید جمشید شہید.....143
☆ مولانا جلال الدین حقانیؒ.....146
☆ پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ.....149
☆ ڈاکٹر عبدالقدیر خان مرحوم.....150

پیش لفظ

(خصوصی اشاعت ماہنامہ الشریعہ بعنوان ''تذکارِ رفتگاں'' اکتوبر ۲۰۱۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بحمد اللہ تعالیٰ مجھے دینی و ملی مسائل پر اخبارات و جرائد میں لکھتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے اور اس سلسلہ میں کم و بیش ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصحابِ علم و دانش نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے جو یقیناً میرے لیے ایک قیمتی سرمایہ اور اعزاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دوران دینی و قومی حوالہ سے بہت سی سرکردہ شخصیات کے بارے میں لکھنے کا موقع ملا اور زندگی میں جن دوستوں اور بزرگوں سے تعلق رہا ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے بارے میں تعزیتی کالم اور شذرات بھی موقع محل کی مناسبت سے قلمبند ہوئے جو رسائل و جرائد کے متنوع اور وسیع ذخائر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ حافظ ناصر الدین خان عامر نے انتہائی محنت اور توجہ کے ساتھ ان تعزیتی مضامین و شذرات کو جمع کر کے زیرِ نظر مجموعہ کی صورت میں کمپوز کیا ہے جو اس کی محنت و کاوش کے ساتھ ساتھ حسن ذوق کی بھی علامت ہے، جناب شبیر احمد خان میواتی نے پرانے مجلات میں سے مواد کی تلاش اور فراہمی میں معاونت کی ہے، جبکہ پروفیسر عمار خان ناصر نے اس مجموعہ کی ترتیب و تدوین اور اسے ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت کے طور پر سامنے لانے کے لیے قابل قدر محنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی و کاوش کو قبولیت سے نوازیں، آمین۔ ابھی بہت سے بزرگوں اور دوستوں کے بارے میں اس نوعیت کے مضامین و شذرات اخبارات و جرائد کی فائلوں میں دبے پڑے ہیں جن کی تلاش جاری ہے، ہماری کوشش ہوگی کہ جو میسر آجائیں انہیں اس کتاب کی اگلی اشاعت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

متعدّد قومی و ملی اور علمی و فکری عنوانات پر میرے مضامین کے ایک درجن کے لگ بھگ مجموعے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام طبع ہو چکے ہیں، جبکہ فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر نے پرانے اخبارات و جرائد کی چھان بین کر کے اب تک بارہ سو سے زائد مضامین ویب سائٹ zahidrashdi.org پر شائع کیے ہیں اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں شامل مضامین ان بزرگوں اور احباب کے حوالہ سے محض جذبات اور تاثرات کا مختصر اظہار ہیں جو بہت سے پہلوؤں سے تشنہ محسوس ہوں گے اس لیے انہیں ایک عقیدت مند، رفیق کار اور کارکن کے احساسات کے طور پر ہی پڑھا جائے اور اس دعا کا اہتمام کیا جائے کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ہم سب کو ان کی حسنات کا سلسلہ جاری رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
یکم اگست ۲۰۱۷ء

شاہ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود شہید

۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو اخبارات میں ڈاکٹر ہنری کسنجر وزیر خارجہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا یہ بیان جلی سرخیوں میں شائع ہوا کہ مشرق وسطیٰ میں ان کا امن مشن اسرائیل کی ہٹ دھرمی کے باعث ناکام ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ صدر انور سادات کا یہ نعرۂ حق بھی منظرِ عام پر آیا کہ اسرائیل نے ہٹ دھرمی ترک نہ کی تو جہاد شروع کیا جائے گا، اور عرب وزراء خارجہ کا ہنگامی اجلاس طلب کیے جانے کی خبر بھی اخبارات کی زینت بنی۔ یہ خبریں اس امر کا احساس دلانے کو کافی تھیں کہ مشرق میں ''کچھ'' ہونے والا ہے اور عرب عوام کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرانے کی سامراجی خواہش کسی چونکا دینے والے حادثہ کو جنم دینے والی ہے۔ چنانچہ اسی روز ریڈیو سے اعلان نشر ہوا کہ سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز کو ان کے بھتیجے فیصل بن مساعد بن عبدالعزیز نے شاہی محل میں گولی مار کر شہید کر دیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پوری دنیائے اسلام پر یہ خبر بجلی بن کر گری اور جس شخص نے بھی یہ اندوہناک خبر سنی، ساکت و مبہوت ہو کر رہ گیا۔ شاہ فیصل شہید نے انتہائی تدبر و فراست اور جرأت و استقلال کے ساتھ یہود اور ان کے سامراجی پشت پناہوں کا مقابلہ کیا تھا۔ فراخدلی کے ساتھ مصر، شام اور اردن کو مالی امداد دے کر ''اغیار'' کے رحم و کرم کا شکار ہونے سے بچایا تھا۔ اور تیل کے ہتھیار کو بڑی کامیابی کے ساتھ دنیائے اسلام اور عرب عوام کے مقاصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ ان عظیم خدمات کے پیش نظر ہر مسلمان کے دل میں شاہ فیصل مرحوم کی محبت و عقیدت گھر کر گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ فیصل شہید کے جسم میں پیوست ہونے والی گولیاں ہر دردمند مسلمان نے اپنے دل میں لگتی ہوئی محسوس کیں اور پورا عالم اسلام سوگوار ہوگیا۔

فیصل شہید کے ساتھ عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کی حکومت اور شاہ فیصل کی جرأت مندانہ پالیسیوں کے مستقبل کا سوال بھی سامنے تھا اور یہ خدشہ ہر زبان پر تھا کہ کہیں سعودی عرب کو کسی ''نام نہاد انقلاب'' کے ذریعہ سازشوں کے خار میں نہ دھکیل دیا جائے۔ جبکہ سعودی عرب، جس نے ایک مدت تک مغربی سامراج کے زیر اثر رہنے کے بعد اس کی سازشوں کو سمجھنے اور ان

سے نبرد آزما ہونے کی جرأت مندانہ روش اختیار کرلی تھی، کہیں اس کے گرد سازشی حصار کو مزید تنگ نہ کر دیا جائے۔ لیکن خدا بھلا کرے جمال عبدالناصر مرحوم کے جانشین، عربوں کے محبوب قائد اور مصر کے غیور و جسور صدر انور السادات کا کہ انہوں نے آگے بڑھ کر ان سازشوں کا دروازہ بند کر دیا۔

شاہ فیصل مرحوم کے جانشین شاہ خالد نے حال ہی میں ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ شاہ فیصل کی شہادت کے بعد جناب انور السادات نے ان سے فون پر رابطہ قائم کیا تو سادات کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا وہ چیخ رہے ہیں۔ سادات کو خدشہ تھا کہ شاہ فیصل کے قتل کی پشت پر سعودی عرب میں انقلاب کی کوئی سازش کار فرما ہے۔ شاہ خالد کے اس بیان کے مطابق صدر انور السادات کے خیال میں یہ قتل انقلاب کی کسی سازش کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے افواج مصر کی کمان شاہ خالد کے سپرد کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر سادات کا یہ جرأت مندانہ اقدام ان کی ایمانی فراست اور سعودی عرب کے عوام کے ساتھ ان کی گہری محبت کا آئینہ دار ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ صدر سادات کی اس بروقت مداخلت کی وجہ سے ہی معاملہ صرف شاہ فیصل کی شہادت پر رک گیا ہو۔

شاہ فیصل کی المناک شہادت کے بعد شاہی خاندان نے متفقہ طور پر ان کے چھوٹے بھائی اور ولی عہد شاہ خالد بن عبدالعزیز کو سعودی عرب کا فرمانروا منتخب کر لیا۔ اور ریاض میں لاکھوں مسلمانوں نے عالم اسلام کے عظیم راہ نما شاہ فیصل کی نماز جنازہ ادا کر کے انہیں سوگوار دلوں اور پرنم آنکھوں کے ساتھ ایک سادہ اور بے نام قبر میں سپرد خاک کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور عالم اسلام کو ان کی جلائی ہوئی جرأت و حمیت کی شمع کو روشن رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۱ اپریل ۱۹۷۵ء)

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم

گزشتہ روز ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (تاریخ وفات: ۱۴ اپریل ۱۹۷۹ء) کی سالگرہ منائی گئی اور قوم کے مختلف طبقات اور جماعتوں نے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کی قومی خدمات کو سراہنے والوں میں

ان کے سیاسی کارکن اور ساتھی بھی تھے اور ان حضرات نے بھی اس سلسلے میں بخل سے کام نہیں لیا جو ان کی زندگی میں ان کے مخالف سیاسی کیمپ میں رہے ہیں بلکہ انہیں اقتدار سے ہٹانے کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ بھٹو مرحوم کے دنیا سے چلے جانے کے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصے کے بعد انہیں اس انداز سے یاد کیا جانا جہاں پاکستان کی قومی سیاست میں ان کے انمٹ کردار کا اعتراف ہے وہاں یہ قوم کی ان سیاسی محرومیوں کا مرثیہ بھی ہے جو بھٹو مرحوم کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد پاکستانی قوم کا نصیب بن گئی ہے اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

مجھے ایک سیاسی کارکن کے طور پر جس دور میں قومی سیاست میں سرگرم کردار ادا کرنے کا موقع ملا وہ وہی دور ہے جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سیاسی سفر کے آغاز اور پھر عروج اور اس کے بعد اقتدار کی سیاست میں ان کے زوال کا دور رہا ہے۔ میں نے اقتدار کی سیاست میں ان کے زوال کی بات جان بوجھ کر کی ہے اس لیے کہ قومی سیاست میں ان کی یاد ابھی تک باقی ہے کہ ان کے نام کے ووٹ بینک میں دراڑیں ڈالنے کی بہت سی کوششوں کو ہم نے دم توڑتے دیکھا ہے۔

بھٹو مرحوم نے جب ایوب خان مرحوم کی وزارت خارجہ سے الگ ہو کر اور بعد ازاں ایک نئی سیاسی جماعت کے اعلان کے ساتھ قومی سیاست میں قدم رکھا تو میں جمعیۃ علماء اسلام کے نوجوان کارکنوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ بھٹو مرحوم کی زبان پر غریب اور کسان کا نام تھا اور وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو بلند آہنگی کے ساتھ لتاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جمعیۃ علماء اسلام کے شعوری کارکنوں کو استعمار دشمنی کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت بھی ورثے میں ملی، اس لیے جمعیۃ کا جو کارکن شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی جدوجہد سے واقف ہے، کسی بھی استعمار کے ساتھ اس کی دوستی دائرہ امکان سے خارج ہے اور سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی نرم گوشہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایسے لوگ اب کم رہ گئے ہیں اور جو کسی کونے میں باقی ہیں انہیں ''معروضی سیاست'' کی جکڑبندیوں نے کسی کام کا نہیں رہنے دیا۔

ایک ''اپ ٹو ڈیٹ لیڈر'' کی زبان پر غریب، کسان، مزدور اور محنت کش کے حقوق کا نعرہ میرے جیسے کارکنوں کو بہت اچھا لگا اس لیے ہم نے مرحوم سے ابتداء میں بہت سی توقعات وابستہ کر لیں اور کچھ

عرصے تک ان کے ساتھ اس نعرے میں ہماری ہم آہنگی بھی رہی۔ مگر سیاست میں ہم زیادہ دیر تک ہم قدم نہ رہ سکے اور جمعیۃ علماء اسلام بھٹو مرحوم کی قائم کردہ پیپلز پارٹی کی ایسی اپوزیشن بنی کہ بھٹو مرحوم کی زندگی میں ان دونوں جماعتوں کی باہمی محاذ آرائی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ بھٹو حکومت کے خاتمے کا باعث بننے والی تحریک نظام مصطفیٰ کی قیادت بھی جمعیۃ علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمودؒ نے کی۔ اس دوران ایک مرحلہ ایسا آیا جب ان دونوں جماعتوں کے درمیان سیاسی ہم آہنگی کے امکانات نظر آنے لگے جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں، پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کے درمیان سہ فریقی معاہدہ ہوا جس کے تحت تینوں جماعتوں نے قومی سیاست میں مشترکہ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ میرے جیسے کارکنوں کے لیے بہت خوشی کا باعث بنا اس لیے کہ اس وقت میرا احساس یہ تھا، جس میں اب تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی سیاسی قیادت کے لیے ذوالفقار علی بھٹو، مفتی محمودؒ اور خان عبد الولی خان کے اشتراک سے وجود میں آنے والی اجتماعی لیڈر شپ سے بہتر کوئی سیاسی ٹیم بن ہی نہیں سکتی۔ لیکن تینوں جماعتوں کا یہ ''ہنی مون'' زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ قومی سیاست میں یہ جماعتیں ایک بار پھر آمنے سامنے آگئیں اور بھٹو صاحب کی زندگی میں آمنے سامنے ہی رہیں۔

یہ ساری باتیں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں جب تک سیاسی زندگی میں ایک کارکن کے طور پر متحرک رہا، بھٹو صاحب مرحوم کے مخالف کیمپ میں ہی رہا اور بھٹو حکومت کے ہاتھوں کئی بار جیل یاترا بھی کی۔ مگر سچی بات ہے کہ اب جب بھٹو مرحوم کی یاد آتی ہے تو کئی حوالوں سے ان کی قومی خدمات کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں پاتا۔ مجھے محترم مجیب الرحمان شامیؒ کے اس ارشاد سے سو فیصد اتفاق ہے کہ بھٹو مرحوم نے ۱۹۷۳ء کے دستور اور ایٹم بم کے حوالے سے پاکستان کو دو گارنٹیاں فراہم کی ہیں او یہ دونوں گارنٹیاں آج پاکستان کی حفاظت کا سب سے مضبوط حصار بن چکی ہیں۔ ایٹم بم کے بارے میں بھٹو مرحوم کی سوچ صرف پاکستان تک محدود نہیں تھی جسے قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان نے اپنی یادداشتوں میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ

> ''جناب بھٹو اک دردمندانہ انداز میں یہ بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ جب یہودیوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور بدھ متوں کے پاس ایٹم بم ہیں تو پھر مسلمانوں کے پاس کیوں نہیں؟ جب میں یہ سنتا ہوں کہ فلاں ملک اور فلاں قوم کے پاس ایٹم بم ہے تو پھر میرے

دل میں بھی یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس بھی ایٹم بم ہو اور یوں ہم بھی ان اقوام کی ہمسری کرنے کے قابل ہوں اور ہمارا سر بھی فخر سے بلند ہو۔''

پاکستان کو ایٹم بم کی تیاری کی راہ پر ڈالنے والے اور اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے والے پہلے لیڈر بھٹو مرحوم تھے۔ اس لیے آج جبکہ پاکستان کے لیے ایٹم بم رکھنے کا جواز عالمی سطح پر ایک سوالیہ نشان بنتا جارہا ہے اور ہماری قومی سیاست کے بعض حلقے اس سوال کو مزید گہرا رنگ دینے کی فکر میں ہیں، بھٹو مرحوم کے اس پیغام کو اور زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا ایٹم بم صرف پاکستان کے حوالے سے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے پورے عالم اسلام کا منظر ان کے ذہن میں موجود تھا۔

مجھے محترم جناب محمد رفیق تارڑ کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ہے کہ بھٹو کی نجات کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ اگرچہ قومی اسمبلی کا تھا لیکن اس کے لیے قائد ایوان کے طور پر بھٹو مرحوم کے کردار کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ تارڑ صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کر مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آگیا، بھٹو مرحوم کو پھانسی لگے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ساہیوال میں اپنے ایک دوست عبد المتین چودھری ایڈووکیٹ کی شادی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ہاں پنجاب میں شادیوں پر بھانڈ حضرات جو شوپیش کرتے ہیں ان میں بعض بہت معنی خیز باتیں ہوتی ہیں۔ اس شادی میں بھی دو بھانڈ آگئے اور اپنے مکالمے میں دیگر بعض سیاسی لیڈروں کے ساتھ بھٹو مرحوم کا بھی تذکرہ کیا۔ ایک بھانڈ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں جنت کی سیر کر کے آیا ہوں وہاں میں نے بھٹو صاحب کو ادھر ادھر گھومتے دیکھا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے سوال کر دیا کہ بھٹو صاحب آپ جنت میں کیسے آگئے؟ بھٹو صاحب نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے کہا کہ تم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس لیے میں نے تمہیں معاف کیا، جاؤ جنت میں چلے جاؤ۔ ان بھانڈوں کی زبان سے یہ مکالمہ سنتے ہوئے میرا احساس یہ تھا کہ زبان خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے اور یہ بھانڈ خلق خدا کے جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں اس لیے کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بھٹو مرحوم کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہو۔

پھر بھٹو مرحوم کا اپنا احساس بھی تو یہی تھا۔ پھانسی سے قبل جیل میں ان کی اسپیشل سکیورٹی کے نگران کرنل رفیع الدین نے ''بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن'' کے عنوان سے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ

''احمدیہ مسئلہ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی بار کچھ نہ کچھ کہا۔ ایک

بار کہنے لگے، رفیع! یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے، یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ایک دن اچانک انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کرنل رفیع! کیا احمدی آج کل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بد دعا کا نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ بھئی! اگر ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ پھر کہنے لگے میں تو بڑا گناہ گار ہوں اور کیا معلوم میرا یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ تعالیٰ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف کر دیں۔"

کرنل رفیع کا کہنا ہے کہ بھٹو صاحب کی باتوں سے میرا یہ اندازہ تھا کہ شاید ان کو گناہ وغیرہ کا کوئی احساس نہیں ہے لیکن اس دن مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۷ جنوری ۲۰۰۶ء)

صدر ضیاء الرحمان شہید

بنگلہ دیش کے صدر جناب ضیاء الرحمان کو گزشتہ دنوں، جب وہ چٹاگانگ کے دورہ پر تھے، فوج کے بعض افسروں کی بغاوت کے دوران قتل کر دیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ بغاوت، جس کی قیادت میجر جنرل منظور احمد کر رہا تھا، بنگلہ دیش فوج کی مداخلت کے بعد ختم ہوگئی ہے۔ جنرل منظور احمد خود قتل ہو گیا ہے جبکہ اس کے رفقاء بنگلہ دیش حکومت کی حراست میں ہیں جن پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

فوج کے ایک حصہ کی طرف سے صدر ضیاء الرحمان کی حکومت کے خلاف بغاوت اور صدر مرحوم کے المناک قتل کا پس منظر کیا ہے اور اس میں کون سے عوامل کارفرما ہیں، اس بارے میں حتمی بات تو اس وقت کہی جا سکے گی جب باغی لیڈروں پر چلائے جانے والے مقدمہ کی تفصیلات سامنے آئیں گی، لیکن اسلامی ممالک اور تیسری دنیا کی مجموعی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہوگا

کہ ناکام فوجی بغاوت بھی عالمی طاقتوں اور بنگلہ دیش کے ہمسایہ مخالف ملکوں کی اس حکمت عملی کا ایک حصہ ہے جو وہ عالم اسلام اور غیر وابستہ ممالک میں عدم استحکام اور باہمی محاذ آرائی کو فروغ دینے کے لیے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ عالم اسلام کا اتحاد اور غیر وابستہ ممالک کا کامل غیر وابستگی کی منزل کی طرف گامزن رہنا بڑی طاقتوں کے مفاد میں نہیں ہے اور اس ''مشترکہ مفاد'' کے تحفظ کے لیے دونوں بڑی طاقتوں کی حکمت عملی یکساں ہے۔ افغانستان میں روس کا کردار اور مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی پالیسی اس پر شاہد ہے۔

صدر ضیاء الرحمان مرحوم ان مسلم راہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے عالم اسلام کے اتحاد اور مسلمان ممالک بالخصوص عراق و ایران کے باہمی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے متحرک اور مؤثر کردار ادا کیا اور آخر وقت تک وہ اس سلسلہ میں سرگرم رہے۔ مرحوم اگرچہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ برسرِ اقتدار آئے لیکن انہوں نے آئینی و سیاسی عمل کے تعطل کو زیادہ دیر نہیں رہنے دیا۔ سیاسی ادارے اور جمہوری عمل بحال کر کے ملک میں انتخابات کرائے جس کے نتیجہ میں ملک کی باگ ڈور ایک بار پھر سیاسی اداروں کے ہاتھ میں آگئی اور خود صدر ضیاء الرحمان مرحوم بھی انتخابات کے ذریعہ ہی دوبارہ برسرِ اقتدار آئے۔

عالم اسلام کے اتحاد کے لیے مساعی اور اندرون ملک جمہوری عمل کی بحالی کے ساتھ ساتھ صدر ضیاء الرحمان مرحوم نے عالمی سطح پر بنگلہ دیش کے آزادانہ تشخص کو ابھارنے اور اسے عالمی برادری میں باوقار مقام دلانے کے لیے بھی مؤثر جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم کی وفات کے غم کو نہ صرف بنگلہ دیش کے عوام نے بلکہ عالم اسلام اور تیسری دنیا کے لوگوں نے بھی محسوس کیا ہے۔

ہم اس موقع پر بنگلہ دیش کے برادر عوام کے اس قومی غم میں شرکت کے ساتھ دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ صدر ضیاء الرحمان مرحوم کی لغزشوں سے درگزر کرتے ہوئے انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور بنگلہ دیش اور وہاں کے عوام کو ہر قسم کی آفات اور آزمائش سے محفوظ رکھیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۲ جون ۱۹۸۱ء)

چودھری ظہور الٰہی شہید

ممتاز مسلم لیگی راہنما چودھری ظہور الٰہی گزشتہ جمعہ کے روز لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب مولوی مشتاق حسین کو اپنی گاڑی پر ان کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے کہ ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک سڑک پر نامعلوم حملہ آوروں کی وحشیانہ فائرنگ کا نشانہ بن کر جاں بحق ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثہ میں مرحوم کے ڈرائیور بھی قتل ہو گئے جبکہ مولوی مشتاق حسین موصوف زخمی ہوئے۔ چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے پاکستان کی قومی سیاست میں جو سرگرم کردار ادا کیا ہے اور قومی تحریکات میں جس جوش و جذبہ کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں اس کے باعث قومی حلقوں میں ان کی المناک موت اور وحشیانہ فائرنگ کی اس مذموم کاروائی پر گہرے رنج و غم اور شدید غم و غصہ کے جذبات کا مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے۔

چودھری صاحب مرحوم کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور پاکستان کی بانی جماعت ہونے کے ناطے سے مسلم لیگ کے احترام کے باوجود ہمیں مسلم لیگی طرزِ سیاست سے ہمیشہ بوجوہ اختلاف رہا ہے۔ لیکن چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا شمار ان معدودے چند لیگی راہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مخلصانہ روش، تحمل، رواداری اور اجتماعی سوچ کے باعث کم و بیش سبھی محب وطن حلقوں سے احترام اور اعتماد حاصل کیا۔ مرحوم کی سیاسی زندگی کا سب سے تابناک دور وہ ہے جب انہوں نے بھٹو آمریت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلہ میں تخویف و تحریص کے تمام ہتھکنڈوں کا پوری جرأت کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے نہ صرف پنجاب کی روایتی سیاست کے بارے میں سابقہ تاثرات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا بلکہ اپنی پنجابیت پر فخر کرتے ہوئے سرحد و بلوچستان کے عوام کے ساتھ یک جہتی اور محبت کا عملی اظہار کر کے علاقائی منافرت پیدا کرنے کی سازش کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے۔ ہمیں اس دور کی سیاست کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے یہ تاثرات اچھی طرح یاد ہیں کہ اگر پنجاب کا یہ سیاستدان ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ہمیں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی مکروہ سازش کو ناکام بنانے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مرحوم کو اس حب الوطنی کی پاداش میں مقدمات، کردار کشی اور دار و گیر کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا لیکن وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن پر کاربند رہے اور بالآخر سرخرو ہوئے۔

ہمارا مقصد چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی خدمات کا احاطہ نہیں بلکہ صرف یہ گزارش کرنا ہے کہ قومی زندگی میں ان کا رویہ ہمیشہ مثبت اور حب الوطنی کا آئینہ دار رہا ہے اور انہوں نے قومی وحدت کے فروغ کو باقی ہر بات پر ترجیح دی ہے۔ آج جبکہ محب وطن عناصر اور مثبت سیاسی قوتوں کے درمیان یک جہتی کے قیام کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، اس ضرورت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے والے ایک سیاسی راہنما کی موت بلاشبہ ایک قومی نقصان ہے۔ ہم اس غم میں مرحوم کے خاندان، رفقاء اور محب وطن حلقوں کے ساتھ شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر سرِدست ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قومی زندگی میں تشدد اور دہشت پھیلانے والوں کا محاسبہ روایتی طریقوں سے نہیں ہوگا بلکہ ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مسئلہ صرف چودھری ظہور الٰہی کی موت کا نہیں، قومی زندگی کو تشدد اور دہشت سے محفوظ رکھنے کا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے المناک قتل کے محرکات و عوامل اور اس کے پشت پناہ عناصر کو بے نقاب کرنے، دہشت گردی کے سرچشموں کا سراغ لگانے اور قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۹ اکتوبر ۱۹۸۱)

ارباب سکندر خان خلیل شہید

صوبہ سرحد کے سابق گورنر اور ملک کے معروف سیاسی رہنما ارباب سکندر خان خلیل گزشتہ روز صبح کے وقت جبکہ وہ معمول کے مطابق سیر کر رہے تھے، قاتلوں کی گولیوں کا نشانہ بنتے ہوئے خالق حقیقی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ارباب صاحب مرحوم کا شمار بااصول، معتدل مزاج اور ایثار پیشہ راہنماؤں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا، بعد میں کالعدم نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہوئے اور اپنے تدبر اور خلوص کی بدولت پارٹی کے مرکزی قائدین میں شمار ہونے لگے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد جب صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی

پارٹی کی مشترکہ وزارتیں قائم ہوئیں اور ارباب سکندر خان خلیل کو سرحد کا گورنر مقرر کیا گیا تو صوبہ کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے سادگی، تواضع اور ایثار کا جو مظاہرہ کیا اس نے پہلے زمانوں کی یاد تازہ کر دی۔ قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمودؒ اس دور میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے اور ہم نے حضرت مفتی صاحبؒ کو ارباب صاحب مرحوم کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان پایا۔ یہ ارباب صاحب کی سادگی اور اصول پرستی کی ایک زریں مثال ہے کہ جب انہیں گورنر کے عہدے سے سبکدوش کر دیا گیا تو وہ حکم وصول کرتے ہی اپنا سامان، جو صرف ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا، اٹھا کر گورنر ہاؤس سے نکل آئے اور سیدھے وزیر اعلیٰ ہاؤس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس پہنچ گئے۔ حتیٰ کہ صبح کا ناشتہ بھی مفتی صاحبؒ کے پاس کیا اور پوچھنے پر کہا کہ جب میں گورنر ہی نہ رہا تو گورنر ہاؤس کا ناشتہ کیوں کرتا۔ گورنری کے دور میں مرحوم پروٹوکول کے آداب اور حفاظتی انتظامات کو ملحوظ رکھے بغیر پشاور اور دوسرے شہروں میں گھومتے اور لوگوں کے احوال معلوم کرتے۔

ارباب سکندر خان خلیل مرحوم کی سیاسی سوچ اور فکر سے بے شمار لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا لیکن ان کا خلوص، دیانت، شرافت، سادگی اور حب الوطنی ہر طبقہ میں مسلم رہی ہے اور اسی وجہ سے ملک کے تقریباً سبھی حلقوں میں ان کے لیے احترام کے جذبات پائے جاتے تھے۔ اور اگر قتل کے اس افسوسناک سانحہ کو مرحوم کے ذاتی اوصاف اور کردار کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کی موت سے سب سے زیادہ نقصان اصولِ سیاست اور خلوص و ایثار کی روایات کو پہنچا ہے۔ آج کے دور میں اس کردار، حوصلہ اور خلوص کے حامل افراد کا جو تناسب معاشرہ بالخصوص قومی سیاست میں ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب صاحب مرحوم کی موت پر ہر محب وطن شہری نے دلی صدمہ محسوس کیا ہے۔

اس موقع پر ہم قتل کے محرکات اور پس منظر کے بارے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ جب تک صحیح صورتحال سامنے نہ آئے کوئی بات کہنا مناسب نہ ہوگی، لیکن لیاقت علی خان مرحوم، ڈاکٹر خان صاحب مرحوم، خواجہ محمد رفیق مرحوم، ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم، مولانا سید شمس الدین مرحوم، عبد الصمد اچکزئی مرحوم اور چوہدری ظہور الٰہی مرحوم ہمارے معروف اور مقتدر سیاسی راہنما تھے جو دن دیہاڑے قتل ہوئے مگر ہم ان کے قاتلوں اور قتل کے پشت پناہوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ اگر سیاسی

قتل گول ہوجانے کی روایت ہمارے ہاں قائم نہ ہوتی تو یقیناً آج تشدد اور تخریب کاری کے رجحانات اس قدر فروغ حاصل نہ کرپاتے۔

ارباب سکندر خان خلیل کا قتل سیاسی ہے یا نہیں، یہ بات وقت بتائے گا لیکن یہ ایک معروف محب وطن اور ایثار پیشہ سیاسی راہنما کا قتل ضرور ہے اور قانون کے نفاذ کے ذمہ دار اداروں کا فرض ہے کہ وہ اس المناک قتل کے محرکات وعوامل کو بے نقاب کریں اور قتل کی تحقیقات جلد از جلد مکمل کرکے قاتلوں کو بلا تاخیر کیفرِ کردار تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ ہم ارباب سکندر خان خلیل کی قومی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ اللہ رب الزت مرحوم کی نیکیوں کو قبول فرمائیں، غلطیوں سے درگزر فرمائیں اور جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۹ مارچ ۱۹۸۲ء)

شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعود مرحوم

گزشتہ دنوں اسلامی کانفرنس کے سربراہ اور سعودی عرب کے فرمانروا جلالۃ الملک شاہ خالد بن عبد العزیز آل سعود انتقال کرگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ خالد چند سال قبل اپنے مرحوم بھائی شاہ فیصل کی شہادت پر ان کے جانشین بنے تھے اور علالت کے باوجود پوری استقامت کے ساتھ اپنے شہیدؒ بھائی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور ان کی پالیسیوں پر گامزن رہے۔ انہوں نے انتہائی نازک دور میں عالم اسلام اور سعودی عرب کی رہنمائی کی اور اب جبکہ وہ بیروت میں فلسطینی عوام کے وحشیانہ قتل عام کو روکنے کے لیے سفارتی جدوجہد میں مصروف تھے کہ اچانک خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی جگہ ان کے بھائی شاہ فہد ان کے جانشین بنے ہیں اور انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ عالم اسلام کی رہنمائی اور سعودی حکومت کی پالیسیوں کے ضمن میں اپنے مرحوم بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے۔

شاہ خالد کی وفات سے جہاں عالم اسلام ایک دردمند اور حساس دل رکھنے والے رہنما اور سعودی عرب کے عوام ایک نیک دل اور مشفق حکمران سے محروم ہوگئے ہیں، وہاں ان کا عین اس حالت میں دنیا سے اٹھ جانا ملت اسلامیہ کے لیے مزید صدمہ کا باعث ہوا ہے جب بیروت میں مظلوم فلسطینیوں پر اسرائیل کی وحشیانہ کاروائیوں کا سلسلہ روز افزوں ترقی پذیر ہے اور ان مظالم کی روک تھام کے لیے

شاہ خالد مرحوم کا دردمندانہ اور مؤثر کردار ادھورا رہ گیا ہے۔

بہرحال شاہ خالد مرحوم آخر دم تک اسلام، عالم اسلام، سعودی عرب اور فلسطینی عوام کی بہتری اور کامیابی کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوگئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کی خدمات اور نیکیوں کو قبول فرمائیں، لغزشوں اور گناہوں سے درگزر کریں اور انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۵ جون ۱۹۸۲ء)

الشیخ ابوالنصر البیانویؒ

شام کے مجاہد عالم دین اور اسلامی محاذ شام کے سیکرٹری جنرل الشیخ محمد غیاث ابوالنصر البیانوی گزشتہ دنوں بیالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کا تعلق حلب کے ایک ممتاز علمی گھرانے سے ہے، ان کے والد محترم الشیخ احمد الدین البیانویؒ اور دادا محترم الشیخ عیسیٰ البیانویؒ اپنے وقت کے ممتاز علماء اور روحانی پیشواؤں میں شمار ہوتے تھے۔ شام میں اہل تشیع کے نصیری فرقہ سے تعلق رکھنے والے سربراہ حافظ الاسد کے دورِ حکومت میں علماء اور اہلِ دین کے خلاف ظلم و تشدد کا جو بازار مسلسل گرم ہے، مرحوم اس کے خلاف علماء حق کی جدوجہد کے سرکردہ راہنما تھے اور حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف منظم جدوجہد کرنے والے اسلامی محاذ کے سیکرٹری جنرل تھے۔

شام میں اس وقت علماء حق مسلسل مصائب اور آلام کا شکار ہیں حتیٰ کہ معروف عالم دین الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ اور دیگر سرکردہ علماء جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہزاروں علماء اور دینی کارکن اب تک اسد حکومت کے مظالم کا شکار ہو کر شہید ہو چکے ہیں اور ہزاروں جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ ایسے حالات میں الشیخ ابوالنصر البیانویؒ جیسے مجاہد عالم دین کا انتقال بلاشبہ اہلِ شام کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ ہم اس غم میں شام کے اہلِ علم اور دینی حلقوں کے ساتھ شریک ہیں اور مرحوم کے لیے مغفرت اور درجات کی بلندی کی پرخلوص دعا کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ شام کے مظلوم و مقہور علماء کو ظلم اور جبر کے اس دور سے جلد نجات عطا فرمائیں اور شام میں اسلامی نظام کے مکمل نفاذ کے لیے علماء شام کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار

فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

خان عبدالغفار خان مرحوم

تحریک آزادی کے ممتاز راہنما اور سرخ پوش تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان گزشتہ روز طویل علالت کے بعد پشاور میں انتقال کر گئے اور انہیں ان کی وصیت کے مطابق جلال آباد، افغانستان میں سپرد خاک کر دیا گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خان عبدالغفار خان مرحوم کا شمار برصغیر کی ان ممتاز شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی کی جرأت مندانہ قیادت کی اور عزم و استقلال کے ساتھ قربانیوں اور مصائب و آلام کے مراحل طے کرتے ہوئے قوم کو آزادی کی منزل سے ہمکنار کیا۔ انہوں نے وطن عزیز کی آزادی کے لیے قید و بند کی مسلسل صعوبتیں برداشت کیں اور تخویف و تحریص کے ہر حربہ کو ناکام بناتے ہوئے برٹش استعمار کو بالآخر اس سرزمین سے بوریا بستر سمیٹنے پر مجبور کر دیا۔

باچا خان مرحوم قیام پاکستان کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے پاکستان کو اپنا وطن قرار دیا، اس سے وفاداری کا حلف اٹھایا اور اس کی تعمیر و ترقی کے عزم کا اعلان کیا۔ ان کے تمام سیاسی نظریات اور پالیسیوں سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور بعض امور میں ان کی تلخ نوائی کو سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہا لیکن اس کے باوجود ان کے خلوص اور اپنے موقف و نظریات پر استقامت ہر دور میں ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ہم اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ خداوند ذوالجلال مرحوم کی لغزشوں سے درگزر کرتے ہوئے انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۹ جنوری ۱۹۸۸ء)

جنرل محمد ضیاء الحق شہید

سترہ اگست کی شام کو ریڈیو پاکستان کی اس المناک خبر نے پوری قوم کو سکتہ کی کیفیت سے دوچار کر دیا کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق بہاولپور کے قریب فضائی حادثہ میں دیگر کئی فوجی افسران کے ہمراہ جاں بحق ہو گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق متعدّد اعلیٰ فوجی افسران کے ساتھ بہاولپور ڈویژن میں فوجی مشقیں دیکھنے کے بعد بہاولپور سے بذریعہ طیارہ اسلام آباد واپس جا رہے تھے کہ پرواز کے چند منٹ بعد ان کا طیارہ دھماکہ کے ساتھ پھٹ کر زمین سے جا ٹکرایا اور بدقسمت طیارے کے مسافروں میں سے ایک فرد بھی نہ بچ سکا۔ اس المناک حادثہ میں جاں بحق ہونے والوں میں صدر کے ہمراہ اعلیٰ فوجی حکام کے علاوہ پاکستان میں امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافیل اور ان کے فوجی اتاشی بھی شامل ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے بعد برسر اقتدار آئے اور انہوں نے نفاذِ اسلام کو اپنی حکومت کا سب سے بڑا مقصد قرار دے کر اس کے لیے وقتاً فوقتاً متعدّد اقدامات کیے۔ ان کے اقدامات کی سست روی اور پالیسی ترجیحات سے ملک کے دیگر دینی حلقوں کی طرح ہمیں بھی اختلاف رہا لیکن یہ بات تمام حلقوں میں یکساں مسلم رہی کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور شریف النفس انسان ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے افغانستان میں روسی جارحیت سے پیدا شدہ صورتحال کا جس استقلال کے ساتھ سامنا کیا اور افغان مجاہدین کی جس طرح سیاسی اور اخلاقی پشت پناہی کی اس نے افغانستان کی آزادی کے لیے جنگ لڑنے والے مجاہدین کو حوصلہ بخشا۔ ان کی سیاسی پالیسیوں اور افکار سے ملک کے بیشتر سیاسی حلقوں کو اختلاف رہا مگر پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور ملکی سالمیت و وحدت کے تحفظ کے لیے ان کی مخلصانہ کوششیں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ ایک درجن سے زائد اعلیٰ ترین فوجی افسروں کا جاں بحق ہونا بھی ایک بہت بڑا قومی المیہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ طیارہ کا حادثہ کیوں پیش آیا؟ اس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور اس خدشہ کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے کہ بدقسمت طیارہ تخریب کاری کا نشانہ بنا اور کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت یہ ہولناک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ سینٹ آف پاکستان میں

سینئر وفاقی وزیر جناب محمد اسلم خٹک کی اس تقریر نے ان خدشات کو اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے کہ کچھ عرصہ سے اس قسم کی سازشوں کی اطلاعات مل رہی تھیں اور انہوں نے صدر مرحوم کو خبردار کر دیا تھا۔ صحیح صورتحال تحقیقات کے بعد ہی سامنے آئے گی تاہم اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط ہونے اور قومی وحدت و یکجہتی کو برقرار رکھتے ہوئے حادثہ کے حقیقی اسباب کو جلد از جلد بے نقاب کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی المناک موت کے بعد یہ بات قومی اور بین الاقوامی حلقوں کے لیے اطمینان کا باعث بنی ہے کہ آئینی عمل کا تسلسل قائم ہے، سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر کا عہدہ سنبھال لیا ہے اور مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتوں کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ۱۶ نومبر کو پروگرام کے مطابق عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے۔ اور یہ بات مزید اطمینان کا باعث بنی ہے کہ صدر غلام اسحاق خان کی صدارت میں ہونے والے کابینہ کے ہنگامی اجلاس میں تینوں مسلح افواج کے سربراہوں نے شرکت کر کے آئینی عمل کے تسلسل کے ساتھ اپنی موافقت اور ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طرح وہ تمام خدشات و خطرات سر دست ٹل گئے ہیں جو صدر ضیاء کی المناک موت کی خبر سنتے ہی محب وطن اور باشعور شہریوں کے لیے ذہنی پریشانی اور قلبی اضطراب کا باعث بن گئے تھے۔

ہم آئینی عمل کے تسلسل اور عام انتخابات کے پروگرام کے مطابق انعقاد کے اعلان کی حمایت کرتے ہوئے قائم مقام صدر جناب غلام اسحاق خان اور ان کے رفقاء کو یقین دلاتے ہیں کہ قومی وحدت و سالمیت کے تحفظ، آئینی عمل کی بالادستی، اسلامی نظام کے مؤثر نفاذ اور جمہوری عمل کی طرف یقینی پیش رفت کے اقدامات میں انہیں ہماری حمایت اور تعاون حاصل رہے گا۔

ہم دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت صدر محمد ضیاء الحق اور دیگر مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں، ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر فرمائیں اور وطن عزیز پاکستان کو اندرونی و بیرونی سازشوں سے محفوظ رکھتے ہوئے ایک صحیح اور مکمل اسلامی ریاست کی منزل کی طرف مؤثر پیش رفت کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲ دسمبر ۱۹۸۸ء)

حافظ بشیر احمد مصری مرحوم

روزنامہ جنگ لندن نے ۱۴ جولائی ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی ہے کہ شاہ جہاں مسجد ووکنگ (لندن) کے سابق امام حافظ بشیر احمد مصری گزشتہ روز ۷۸ برس کی عمر میں لندن کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خبر میں حافظ صاحب مرحوم کا تعارف ماحولیات اور تحفظ حیوانات کے ایک مسلم ماہر کی حیثیت سے کرایا گیا ہے جنہوں نے اس شعبہ میں نمایاں تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں اور اسلام میں حیوانات کے ساتھ برتاؤ کے موضوع پر ان کے مقالہ کو بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حافظ صاحب مرحوم کا ایک اور تاریخی تعارف بھی ہے جو قادیانی مسلم کشمکش کے حوالہ سے ہے اور جس کے تذکرہ کے بغیر نہ حافظ صاحب مرحوم کا تعارف مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی "مسلم قادیانی کشمکش" کی تاریخ کی تکمیل ہوتی ہے۔

حافظ بشیر احمد مصری ۱۹۱۴ء میں قادیان میں ایک ممتاز قادیانی شیخ عبدالرحمان مصری کے ہاں پیدا ہوئے جن کا تعلق لاہور کے ایک ہندو گھرانے سے تھا لیکن وہ ہندوازم چھوڑ کر قادیانیت کے فریب کا شکار ہو گئے تھے اور ان کا شمار قادیانی جماعت کے سرکردہ حضرات میں ہوتا تھا۔ حافظ بشیر احمد نے قادیان کے ماحول میں پرورش پائی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کو قریب سے دیکھا جو ان کی قادیانیت بلکہ نفس مذہب سے برگشتگی کا باعث بن گیا۔ انہوں نے اپنی مطبوعہ یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس وقت کے قادیانی سربراہ مرزا بشیر الدین محمود اور نام نہاد "خاندان نبوت" کے دیگر سرکردہ افراد کی جنسی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کے ایسے ہوشربا مناظر ان کے مشاہدہ میں آئے کہ ایک وقت میں مذہب اور خدا کی ذات سے بھی ان کا اعتقاد اٹھ گیا اور وہ دہریت کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ مرزا بشیر الدین محمود کے "جنسی معرکوں" کا ذکر بابائے صحافت مولانا ظفر علی خانؒ نے بھی "زمیندار" میں بار بار کیا ہے اور اس موضوع پر خود قادیانی امت کے افراد کے اعترافات پر مشتمل "تاریخ محمودیت" کی شہادت موجود ہے۔ ایک دور میں اس کتاب کی اشاعت پر پابندی تھی اس لیے یہ "شہر سدوم" اور "ربوا کا راسپوٹین" کے نام سے بھی چھپ چکی ہے، اس میں ان افراد کے حلفیہ بیانات ہیں جو مرزا بشیر الدین محمود اور اس خاندان کے دیگر سرکردہ حضرات کی "جنسی ہوس" کا شکار ہوئے۔

یہ مرزا بشیر الدین محمود کے بھرپور شباب کا زمانہ تھا اور حافظ بشیر احمد مصری کی اٹھتی جوانی تھی اس

لیے انہیں بھی ”مخصوص گینگ“ میں شامل کر لیا گیا لیکن وہ زیادہ دن اس ماحول کو برداشت نہ رکھ سکے۔ پہلے کچھ عرصہ ذہنی تذبذب کا شکار رہے پھر ساری صورت حال باپ کے سامنے رکھ دی۔ شیخ عبد الرحمان کے لیے بھی یہ صورتحال خلاف توقع تھی لیکن تحقیق پر بیٹے کی باتیں درست ثابت ہوئیں تو مرزا بشیر الدین محمود کے نام پے در پے خطوط میں ان سے مطالبہ کیا کہ وہ برأت ثابت کریں ورنہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ مرزا محمود نے شیخ عبد الرحمان مصری اور ان کے خاندان کو قادیانی جماعت سے نکالنے اور معاشرتی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس دوران حافظ بشیر احمد مصری پر قادیان میں قاتلانہ حملہ بھی ہوا جس میں ان کا ایک ساتھی جاں بحق ہو گیا۔ اس خاندان کی حفاظت کے لیے حکومت کو پولیس کی گارد مقرر کرنا پڑی اور مجلس احرار اسلام نے بھی ان کے گھر کے سامنے حفاظت کے لیے رضاکاروں کا کیمپ لگا دیا۔ یہ اس صدی کے چوتھے عشرہ کی بات ہے اور اس دور کے اخبارات ان واقعات کے تذکرہ سے بھرے پڑے ہیں۔ حافظ منیر احمد نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس دور میں ان کے ذہن پر دہریت کا غلبہ ہو گیا تھا حتیٰ کہ ایک موقع پر باپ نے اپنے لیے دعا کرنے کی تلقین کی تو جواب دیا کہ کس سے دعا کروں جس کا کوئی وجود ہی نہیں (معاذ اللہ)۔

شیخ عبد الرحمان مصری نے قادیانیت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود کے مخالف دھڑے لاہوری گروپ میں شمولیت اختیار کر لی اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جبکہ حافظ بشیر احمد مصری کا رابطہ مجلس احرار اسلام کے راہنماؤں سے ہوا جو ان کی ہدایت کا ذریعہ بن گیا۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں اس حوالہ سے امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ، چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ بالآخر ۱۹۴۰ء میں امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ انہیں لے کر تبلیغی جماعت کے امیر حضرت مولانا محمد الیاس دھلویؒ کے پاس حاضر ہوئے اور حافظ بشیر احمد نے ان کے ہاتھ پر قادیانیت سے تائب ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد حافظ صاحب مرحوم کا رابطہ قادیانی جماعت اور اپنے خاندان دونوں سے کٹ گیا اس لیے ۱۹۴۱ء میں ہندوستان چھوڑ کر مشرقی افریقہ چلے گئے جہاں بیس سال قیام کیا۔ پھر ۱۹۶۱ء میں برطانیہ چلے گئے، اس دور میں ووکنگ کی شاہ جہاں مسجد اس علاقہ کی مرکزی جامع مسجد کی حیثیت رکھتی تھی جو قادیانیوں کے تصرف میں تھی، اسے چند مخلص مسلمانوں نے بے حد تگ و دو کے بعد قادیانیوں کے

تسلط سے چھڑایا اور حافظ بشیر احمد اس مسجد کے پہلے مسلمان امام مقرر ہوئے۔ حافظ صاحب کو یہاں بھی قادیانیت سے معرکہ آرائی کا سامنا کرنا پڑا جس میں وہ کامیاب رہے چنانچہ وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ:

> ”خدا نے جو سب سے زیادہ مسرت بخش اسلام کی خدمت کرنے کی مجھے توفیق دی وہ یہ تھی کہ ووکنگ مسجد کی امامت سے مستعفی ہونے سے قبل ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس مسجد اور مرکز میں اب کبھی بھی کسی مرزائی امام کا تقرر نہیں ہوسکتا“۔

۱۹۶۸ء میں ووکنگ مسجد کی امامت سے الگ ہوگئے اور مسلم ممالک کا بائی روڈ سفر شروع کیا جو تقریباً تین سال جاری رہا، اس دوران چالیس سے زیادہ ممالک میں گئے اور مسلم ممالک کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ قادیانی امت کے موجودہ سربراہ مرزا طاہر احمد نے تین سال قبل دنیا بھر کے مسلم راہنماؤں کو مباہلہ کی دعوت دی تو اس کی ایک کاپی حافظ بشیر احمد مرحوم کو بھی بھجوائی۔ حافظ بشیر احمد صاحب نے یہ چیلنج مرزا طاہر احمد کے نام ایک کھلے خط کی صورت میں قبول کیا لیکن مرزا طاہر احمد نے میدان مباحثہ میں آنے کی ہمت نہ کی۔

حافظ بشیر احمد مرحوم کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ شکوک پھیلائے جاتے رہے کہ ان کے عقائد اب بھی لاہوری مرزائیوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن ۱۹۶۸ء میں مناظر اسلام حضرت مولانا لال حسین اختر کی برطانیہ آمد کے موقع پر دونوں کی گفت وشنید ہوئی اور مولانا لال حسین اختر نے تحریری طور پر ان شکوک کو رد کیا اور کہا کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔

راقم الحروف کی ملاقات حافظ بشیر احمد مصری مرحوم سے ۱۹۸۵ء یا ۱۹۸۶ء میں لندن کی سالانہ ختم نبوت کے موقع پر ہوئی، کچھ زیادہ گفت وشنید کا موقع نہیں ملا لیکن یہ سعادت کیا کم تھی کہ زندگی میں اس تاریخی شخص کو دیکھنے کا موقع مل گیا جس نے اس دور میں مرزا قادیانی کے نام نہاد ”خاندان نبوت“ کو بے نقاب کرنے کی جرأت کی جب قادیانیت کے خلاف بات کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ بہرحال حافظ بشیر احمد مرحوم تحفظ حیوانات اور ماحولیات کے ماہر ضرور تھے اور اس شعبہ میں ان کی خدمات یقیناً وقیع ہوں گی لیکن وہ ہماری مذہبی تاریخ کا بھی ایک جرأت مندانہ اور باحوصلہ کردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں، ان کی نیکیاں قبول کریں، غلطیوں کی معافی دیں اور جنت

الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

محمد صلاح الدین شہید

وہ دن بلاشبہ پاکستان کی صحافتی تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے جب ہفت روزہ تکبیر کراچی کے مدیر اعلیٰ محمد صلاح الدینؒ سفاک قاتلوں کی دہشت گردی کا نشانہ بنتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ محمد صلاح الدینؒ بے لاگ تجزیہ نگار اور بے باک قلمکار ہی نہیں بلکہ معاشرہ میں شر کی قوتوں کو چیلنج کرنے اور ظلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے والے بے خوف راہنما بھی تھے۔ انہوں نے لفافے، بریف کیس اور کلاشنکوف کے اس دور میں صحافت اور سچائی کے رشتے کو قائم کیا اور اسلام و پاکستان کے پرچم کو سربلند رکھا اور بالآخر اسی راہِ وفا میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔

راقم الحروف محمد صلاح الدین شہیدؒ کا پرانا قاری اور ان کی حق گوئی کا معترف رہا ہے۔ مختلف مجالس میں ان سے ملاقات بھی ہوتی رہی ہے مگر اسی سال اگست میں ان کے ساتھ چند روز کی رفاقت کا موقع ملا تو یہ بات مشاہدہ کا حصہ بنی کہ قلم کا محمد صلاح الدینؒ اور عمل کا محمد صلاح الدینؒ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ وہ اگست ۱۹۹۲ء میں ورلڈ اسلامک فورم کی دعوت پر چند روز کے لیے لندن تشریف لے گئے، فورم کے سالانہ تعلیمی سیمینار میں ''اسلامی نظام تعلیم و تربیت میں ذرائع ابلاغ کا کردار'' کے موضوع پر پر مغز مقالہ پیش کیا جو الشریعہ کے گزشتہ شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ٹونگھم اور لیسٹر میں فورم کے زیر اہتمام مختلف اجتماعات سے خطاب کیا۔ جنوبی افریقہ سے پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور اسلام آباد سے ڈاکٹر محمود احمد غازی کے علاوہ ورلڈ اسلامک فورم کی طرف سے مولانا محمد عیسیٰ منصوری، مولانا مفتی برکت اللہ اور راقم الحروف بھی ان نشستوں میں شریک رہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ یادگار ملاقاتیں زندگی کی آخری ملاقاتیں ثابت ہوں گی۔

آج کے دور میں جبکہ معاشرہ کے ہر طبقہ میں بھرم قائم رکھنے کے لیے ریڈی میڈ میک اپ کا سامان ہر وقت جیب میں رکھنا ضروری سمجھا جا رہا ہے اور شخصی زندگی اور قومی زندگی کے درمیان تفاوت کی دیوار کلچر کا حصہ بنتی جا رہی ہے، ایک ہی چہرے کے ساتھ سب سے نباہ کرنے والا ''محمد صلاح

الدین'' یقیناً پرانے دور کی شرافت، وضع داری اور سچائی کی علامت بن گیا تھا جو بے قید امنگوں کے ساتھ اکیسویں صدی کی طرف بڑھنے والے مادر پدر آزاد جذبوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔

محمد صلاح الدین نے اسلامی اقدار کی سربلندی اور ملکی سالمیت اور قومی خود مختاری کی جنگ میں بے دلیل دشمن کو گولی کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا جو ان کی اخلاقی فتح ہے۔ اور اگر راہِ وفا کے راہرو ''اخلاقی فتح'' کا یہ پرچم تھامے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ آگے بڑھتے رہے تو اسے عملی فتح کی منزل سے ہمکنار کرنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ شہید کے درجات بلند فرمائیں اور اہل قلم کو ان کی طرح قلم کی آبرو کا تحفظ کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۱۹۹۵ء)

محترمہ لیڈی ڈیانا

برطانوی شہزادی لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت پر دنیا بھر کے اخبارات میں مسلسل لکھا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ اس پر اپنے اپنے انداز سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے دو تبصرے ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ایک تبصرہ تو لیڈی ڈیانا کے سابق ذاتی معالج کا ہے جو بی بی سی کے حوالہ سے روزنامہ جنگ لندن نے یکم ستمبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے، اس کے مطابق

> ''ڈیانا کا شمار دنیا کی ان چند خواتین میں ہوتا تھا جو چھوٹی سی عمر میں دنیا بھر کے میڈیا کی ڈارلنگ رہی ہیں، اس کا ایک ایک سیکنڈ لاکھوں پونڈ میں فروخت ہوا، اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگوں کا مجمع لگ جاتا۔ اس کے چند لفظوں پر لوگ سماجی تنظیموں کو لاکھوں پونڈ کا چندہ دے دیتے، اس کے ایک انٹرویو پر رپورٹوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوتا، اس کے پاس دولت تھی، حسن تھا، کرشماتی شخصیت تھی، دنیا بھر کے دولت مند اس کی چوکھٹ پر پڑے رہتے تھے لیکن وہ تنہا، اداس اور پریشان حال تھی۔ جب سارے ہنگامے ختم ہو جاتے اور اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا تو وہ شب خوابی کے لباس میں رات گئے تک اپنے ڈرائنگ روم میں چہل قدمی کرتی رہتی۔ اس نے آخری عمر میں بے تحاشہ سگریٹ پینا شروع کر دیے تھے، اس کی ذات میں شک بڑھ گیا تھا اور وہ کسی شخص پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی کیونکہ اس کے ہر دوست نے کچھ عرصے بعد

خلوت کے راز فروخت کر کے نوٹ کھرے کر لیے تھے۔"

دوسری طرف روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۷ ستمبر ۱۹۹۷ء کی اشاعت میں لیڈی ڈیانا کی زندگی کے سب سے آخری انٹرویو کے دو اقتباسات نقل کیے ہیں جو فرانس کے اخبار "لی موندے" کو دیا گیا تھا اور جس میں لیڈی ڈیانا نے کہا ہے کہ

"وہ اسلام کی عظیم روایات سے بہت متاثر ہے اور انگلستان میں خاندان کے تباہ ہونے والے نظام کی بحالی کے لیے اسلامی روایات سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے اور مسلمان جس طرح عورتوں کا احترام کرتے ہیں اس کا تصور کسی غیر مسلم معاشرہ میں ناممکن ہے۔ مسلمان مرد وفادار ہوتے ہیں اور جن مغربی عورتوں نے مسلمانوں سے شادیاں کیں ان میں سے زیادہ تر شادیاں کامیاب رہیں۔ معلوم نہیں مغربی پریس میری مسلم دوستی پر کیوں سیخ پا ہے؟ یہ میرا نجی معاملہ ہے، میرے اپنے خیالات واحساسات ہیں، میں اسلام سے متاثر ہوں اور اس کا مجھے اعتراف ہے"۔

لیڈی ڈیانا اور ان کے ذاتی معالج کے ان تبصروں کی روشنی میں لیڈیا ڈیانا کی حادثاتی موت پر دنیا بھر میں رونما ہونے والے ردعمل کی تہہ تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ لیڈی ڈیانا دراصل مغرب میں خاندانی نظام کی تباہی سے جنم لینے والی ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی الجھنوں کی علامت بن گئی تھی اور اس نے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کی منزل حاصل کرنے کے لیے شاہی اقدار اور خاندان کی روایات سے بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ لیڈی ڈیانا کی اس حادثاتی موت پر عالمی سطح پر اسے ملنے والی پذیرائی اسی بغاوت کی صدائے بازگشت ہے جس سے مغربی تہذیب کی باقی ماندہ عمر کا آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

حکیم محمد سعید شہید

حکیم محمد سعید کے المناک قتل پر کونسی آنکھ ہے جو اشکبار نہیں ہوئی ہوگی، اور کونسا دل ہے جس پر رنج وغم کے نشتر نہیں چلے ہوں گے۔ خدا غارت کرے ان سفاک قاتلوں کو جنہوں نے اس شریف

النفس انسان کے خون سے ہاتھ رنگے، اور قہر نازل کرے ان منصوبہ سازوں پر جو علم و اخلاق کے اس سفیر کے قتل کی شرمناک سازش کے مرتکب ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم صاحب کے ساتھ میرا براہ راست تعارف نہیں تھا اور کوئی ایسی مجلس یاد نہیں جس میں ان سے آمنا سامنا ہوا ہو۔ مگر ان کی فکر، سوچ، جدوجہد اور تگ و دو سے ہمیشہ شناسائی رہی اور وقتاً فوقتاً خط و کتابت کا رابطہ بھی قائم رہا۔ حکیم صاحب طب کی دنیا کی ایک نامور شخصیت تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ ان کا تعارف علم و دانش کی دنیا میں تھا۔ اور انہوں نے جس تسلسل اور وضعداری کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں فکر و دانش کی محفلیں آباد کیں اس کی یاد ایک عرصہ تک ان کے نیاز مندوں کے دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔ وہ ایک سچے و کھرے مسلمان تھے اور ان کا اسلام بیان و تقریر سے کہیں زیادہ ان کی عملی زندگی میں جھلکتا تھا۔ آج کے دور میں اس سطح کا کوئی شخص پانچ وقت نماز کی پابندی کر لے اور حرام و حلال کے بنیادی امور کا عملی زندگی میں لحاظ کر لے تو اس کی ولایت اور دینداری مسلم ہو جاتی ہے۔ جبکہ حکیم صاحب تو عملی زندگی میں اس سے کہیں آگے تھے۔ ہر وقت باوضو رہنا، لباس و خوراک میں سادگی کا اہتمام، حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت کے مطابق ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنے کی پابندی اور غرباء و مساکین کی عملاً سرپرستی اس دور میں اور اس درجہ کی مصروف زندگی کے ساتھ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ انہی کا کام تھا اور وہی ان سب امور کی وضعداری اور وقار کے ساتھ آخر دم تک نباہ گئے۔

حکیم محمد سعید شہید ایک کھرے مسلمان اور محب وطن پاکستانی تھے۔ اپنے دین اور وطن کے لیے ان کی غیرت و حمیت ان کے بیانات اور مضامین میں صاف طور پر محسوس کی جاتی تھی۔ انہیں اسلامی اقدار و روایات کے ساتھ محبت تھی اور وہ ہر معاملہ میں انہیں ملحوظ رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ بظاہر اس چھوٹے سے واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات کے حوالہ سے ہم نے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے علمی و فکری جریدہ ''الشریعہ'' کی ۱۹۹۷ء کی چار اشاعتیں ''تحریک آزادی اور تحریک پاکستان'' کے مختلف عنوانات کے لیے مخصوص کرنے کا اعلان کیا تو حکیم صاحب مرحوم نے راقم الحروف کے نام ایک تفصیلی خط میں اس پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ حکیم صاحب ''الشریعہ'' کے مستقل قاری تھے اور انہیں شکایت یہ تھی کہ ہم نے پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات پر خصوصی

اشاعتوں کا اہتمام ہجری سن کے لحاظ سے اس وقت کیوں نہیں کیا جب حکیم صاحب اور ان کے رفقاء نے وطن عزیز کی پچاس سالہ تقریبات منائی تھیں اور اب عیسوی سن کے اعتبار سے منائی جانے والی پچاس سالہ تقریبات میں ہم کیوں شریک ہو رہے ہیں؟ راقم الحروف نے جواب میں انہیں لکھا کہ ہم تو ویسے ہی اس قسم کی تقریبات کے قائل نہیں ہیں اور صرف تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں علماء حق کے کردار کو نئی نسل کے سامنے لانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس جواب سے وہ مطمئن ہوئے یا نہیں لیکن ان کے اشکال اور اعتراض سے یہ بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے معمولات میں اسلامی اقدار و روایات کی پابندی کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

حکیم صاحب قیام پاکستان کے مقصد سے شعوری طور پر آگاہ تھے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے علمی و فکری محاذ پر وہ ہمیشہ مستعد اور سرگرم عمل رہے۔ بالخصوص ایک مثالی ریاست کے ڈھانچے کی علمی بنیاد فراہم کرنے اور اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال واضح کرنے میں انہوں نے جو کدو کاوش کی وہ مقالات ہمدرد کی ان ضخیم جلدوں سے ظاہر ہے جو ان محاذوں پر ہمیشہ ارباب فکر و دانش کی راہنمائی کرتی رہیں گی۔

وہ سیاست کی دنیا کے آدمی نہیں تھے اور اگر کچھ عرصہ کے لیے وقتی طور پر عملی سیاست کے بکھیڑوں میں الجھے بھی تو وہ انہیں راس نہ آئی اور وہ پھر سے اپنی علم و دانش کی دنیا میں واپس لوٹ گئے۔ ان کا تعلق علم سے تھا، کتاب سے تھا، دانش سے تھا، اور اخلاق سے تھا۔ وہ عمر بھر انہی کے نمائندہ رہے۔ انہوں نے اسلامی اخلاقیات کو اجاگر کرنے اور اخلاق کی کساد بازاری کے اس دور میں عام لوگوں کو اخلاقی قدروں کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے اپنے بیانات، مضامین اور ہمدرد کے اشتہارات و جرائد کے ذریعہ جو محنت کی وہ ان کے خصوصی ذوق کی علامت اور آئینہ دار تھی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کے تحفظ، اسلامی احکام و اقدار کی عملداری، قومی وحدت اور ملکی سالمیت کی حفاظت کے لیے وہ ہمیشہ بلند آہنگ رہے اور انہوں نے کسی بھی مصلحت اور رعایت کو کبھی اس معاملہ میں روا نہیں رکھا۔ ملک کے موجودہ حالات پر ان کی بے چینی اور اضطراب ان کے مضامین اور بیانات سے عیاں تھا۔ اور انہیں علماء اور اہل دانش سے ہمیشہ اس بات کی شکایت رہی کہ وہ حالات کی سنگینی کا ادراک حاصل کرنے، مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کے لیے قوم کی راہنمائی کے باب میں اپنے فرائض صحیح

طور پر ادا نہیں کر رہے۔ چنانچہ وہ راقم الحروف کے نام ایک حالیہ خط میں لکھتے ہیں کہ

''اس وقت صورتحال یہ ہے کہ سیاست و قیادت نیز صحافت و امامت میں سے کوئی تیار نہیں ہے کہ وہ امہ مسلم پاکستانیہ کو حقائق سے آگاہ کرے۔ نہ صرف حالات حاضرہ کی سنگینی کا اظہار کرے بلکہ پاکستان اور اہل پاکستان کے ساتھ کل جو ہونے والا ہے اس سے آگاہی بخشے۔ یہ سب کے سب اس موضوع میں مجتمع ہیں کہ ملت کو غافل رکھا جائے تاکہ مستقبل قریب میں لادینیت، یہودیت، عیسائیت اور قادیانیت کے مشترکہ حملے ہوں تو پوری قوم حیران اور بے بس نظر آئے۔

یہ ایک بدترین کوتاہی ہے بلکہ گناہ کبیرہ ہے کہ حقائق کا، جنہیں وہ جانتے ہیں اخفاء کیا جائے۔ خلیج میں اور اس سے قبل مراکش، تونس، الجزائر اور مصر میں اسلام اور مسلمین کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے وہ سامان عبرت ہے۔ ان مقامات پر مسلمان کے گلے میں پھانسی کے پھندے لگائے جا چکے ہیں اور پیروں میں آہنی زنجیر ہائے اسیری ڈال دی گئی ہیں۔ غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ اس سب کے باوجود اتحاد بین المسلمین کی ایک آواز اب تک بلند نہیں ہوتی، ایک مسلمان ملک دوسرے کے سامنے آج بھی صف آراء ہے۔

ان حالات میں صرف اور صرف پاکستان ایک نہایت مؤثر کردار ادا کر سکتا ہے مگر پاکستان میں اسلام اس مولوی کا عنوان زیست ہے کہ جس کا ایک ہاتھ محراب پر عالم حق کے نرخرے میں ہے اور دوسرا ہاتھ منبر پر ''خطاب کفر'' پر ہے۔ علماء حق کی خاموشی پاکستان کے لیے شدید نقصان سے عبارت ہے اور ان کی بیداری اشد ضروری ہے۔''

اس سے اسلام، عالم اسلام اور پاکستان کے لیے حکیم صاحب کے احساسات و جذبات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور ان کے وحشیانہ قتل سے وطنِ عزیز کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کمیت و کیفیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور دین، قوم اور ملک کے لیے ان کے جذبات و احساسات کو قبول فرماتے ہوئے عالم اسلام اور پاکستان کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

شاہ حسین مرحوم

اردن کے فرمانروا شاہ حسین کی وفات پر کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا تھا مگر ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ حامد میر صاحب نے پہل کر دی اور تاریخ کے ان بے نقاب گوشوں سے پردہ سرکایا جن سے ہماری آج کی نسل قطعی طور پر ناواقف ہے۔ چنانچہ ان کے ''تقدم'' کے اعتراف اور ان کے لیے دعائے خیر کے ساتھ اس حوالہ سے کچھ گزارشات پیش کر رہا ہوں۔

جہاں تک شاہ حسین کی وفات کا معاملہ ہے ایک مسلم حکمران اور پاکستان کے ایک دوست کی وفات کا ہمیں بھی رنج ہے اور ہم دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی غلطیاں معاف فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ ہم پر ان کا حق ہے۔ لیکن ان کے اور ان کے خاندان کے جو فضائل و مناقب بیان کیے جا رہے ہیں اور جس طرح مشرق وسطیٰ میں امن کے ہیرو کے طور پر انہیں پیش کیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر اصل حقائق کو سامنے لانا اور نئی نسل کو ان سے متعارف کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے اور اسی جذبہ کے ساتھ چند معروضات سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔

ترکی کی خلافت عثمانیہ نے کئی صدیوں تک دنیا میں ایک سپر پاور کے طور پر حکمرانی کی ہے اور موجودہ عیسوی صدی کے آغاز تک عرب کے بیشتر علاقے، جن میں حجاز مقدس اور فلسطین، بیت المقدس اور اردن کے خطے بھی شامل ہیں، خلافت عثمانیہ ہی کے حصے اور اس کے صوبے تھے۔ شاہ حسین مرحوم کے پردادا حسین بن علی جنہیں شریف مکہ کہا جاتا تھا، خلافت عثمانیہ کی طرف سے مکہ مکرمہ کے والی (گورنر) تھے۔ وہ عثمانی پارلیمنٹ کے ممبر کے طور پر کم و بیش ستر سال استنبول میں مقیم رہے، اس کے بعد انہیں مکہ مکرمہ کا گورنر مقرر کیا گیا اور وہ اس حیثیت سے شریف مکہ کہلاتے تھے۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس میں یہودیوں نے جرمنی کے خلاف دیگر یورپی ممالک کا اس شرط پر ساتھ دیا اور اپنی دولت کے دروازے ان کے لیے کھول دیے کہ وہ فلسطین میں انہیں بسانے اور ان کی الگ مملکت (اسرائیل) کے قیام کی راہ ہموار کریں گے۔ خلافت عثمانیہ اس جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی اس لیے جرمنی کی شکست کے اثرات خلافت عثمانیہ پر بھی پڑے اور اس کے خلاف فرنگی استعمار کی سازشیں تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ انگریز جاسوس کرنل لارنس آف عریبیہ نے مسلمان کے روپ میں عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا اور عرب قومیت کا مسئلہ کھڑا کر کے خلافت

عثمانیہ کے خلافت بغاوت کے بیج بوئے۔

قاہرہ میں برطانوی نمائندے لارڈ کچنر نے ۱۹۱۵ء میں شریف مکہ حسین بن علی کے بیٹے اور مرحوم شاہ حسین کے دادا شاہ عبداللہ سے ملاقات کی اور ان دونوں کے درمیان عرب علاقے کو خلافت عثمانیہ سے باغی کرنے کی سازش تیار ہوئی۔ جس کے ابتدائی انتظامات مکمل ہونے کے بعد شریف مکہ حسین بن علی نے ۱۰ جون ۱۹۱۴ء کو مکہ مکرمہ میں اپنے محل سے فائر کر کے ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا۔ شریف مکہ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اسے پورے عرب کا بادشاہ بنا دیا جائے گا اور عربوں کی متحدہ سلطنت قائم کی جائے گی اور اس لالچ میں اس نے بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد ترکی فوجوں کے ساتھ باغیوں کی جنگ ہوئی جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور اسی دوران ترک افواج کی کمک کو روکنے کے لیے قسطنطنیہ (استنبول) سے مدینہ منورہ تک آنے والی حجاز ریلوے کی پٹڑی کو اکھاڑ کر ریل کے نظام کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

اسی موقع کی بات ہے کہ متحدہ ہندوستان سے تحریک آزادی کے عظیم رہنما شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرنگی اقتدار کے خلاف بغاوت کی اندرونی تیاریاں مکمل کر کے ترک رہنماؤں سے مذاکرات کے لیے حجاز مقدس پہنچے ہوئے تھے اور اس جنگ کی تیاری کے آخری مراحل میں تھے جسے تحریک ریشمی رومال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے حجاز مقدس میں شریف مکہ کی طرف سے ایک فتویٰ پیش کیا گیا جس میں ترکوں کو کافر قرار دے کر ان کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیا گیا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے اس فتویٰ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور اسے عالم اسلام کی تباہی کا پیش خیمہ قرار دیا۔ اس انکار کی پاداش میں شریف مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور وہ اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ ساڑھے تین سال تک جزیرہ مالٹا میں بغاوت کے الزام میں نظر بند رہے۔

شریف مکہ نے بغاوت کر کے ترکوں کے قدم عرب ممالک سے اکھاڑ دیے اور مختلف عرب ممالک میں لارنس آف عربیہ کی پھیلائی ہوئی عرب قومیت کی تحریکات نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ مگر ترکوں کے قدم اکھڑ جانے اور خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے شریف مکہ سے آنکھیں پھیر لیں اور اسے پورے عرب کا بادشاہ بنانے کی بجائے عرب خطے کو کئی خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر کے اس بندر بانٹ میں یہودیوں کے لیے اسرائیل کی ریاست کا راستہ نکال لیا، دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین

میں لاکر آباد کیا گیا اور فلسطینیوں کو دربدر کر دیا گیا۔ اور اسرائیل کے قیام سے لے کر اسے مستحکم کرنے اور مسلسل حفاظتی حصار میں رکھنے کے لیے برطانیہ اور اس کے جانشین امریکہ نے اب تک جو کردار ادا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

انگریزوں نے شریف مکہ حسین بن علی کو تو عرب دنیا کا بادشاہ نہ بنایا مگر اس کے بیٹے عبداللہ کو، جس نے لارڈ کچنر کے ساتھ بیٹھ کر خلافت عثمانیہ کے خلاف سازش تیار کی تھی، دریائے اردن کے کنارے پر ایک پٹی کا حکمران بنا کر شاہ اردن کا خطاب دے دیا۔ اردن کے مرحوم شاہ حسین اسی شاہ عبداللہ کے پوتے اور جانشین تھے۔ چنانچہ اسرائیل کو سب سے پہلے تسلیم کر کے مشرق وسطیٰ میں امن کے امریکی منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے شاہ حسین مرحوم نے جو کردار ادا کیا اسے صدر کلنٹن کے اس خطاب کی روشنی میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے جو چند سال قبل انہوں نے اردن کی پارلیمنٹ کے سامنے کیا تھا اور جس میں شاہ حسین کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

> ”آپ نے تو اس وصیت سے بھی بہت آگے بڑھ کر کردار ادا کیا ہے جو آپ کے دادا شاہ عبداللہ نے کی تھی۔“

الغرض مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے قیام و استحکام اور خلافت عثمانیہ کی بربادی کے لیے اس خاندان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ بلاشبہ ایک تاریخی کردار ہے اور امت مسلمہ کبھی اسے فراموش نہیں کر سکے گی۔ اس سلسلہ میں پنجاب یونیورسٹی کے ”دائرہ المعارف الاسلامیہ“ کے مقالہ نگار نے شریف مکہ حسین بن علی یعنی شاہ حسین کے پردادا کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے، اور جو مسلمانوں کی موجودہ تاریخ میں اس خاندان کا اصلی تعارف ہے کہ

> ”یہ حقیقت ہے کہ اگر شریف حسین اور اس کے بیٹے انگریزوں کے دام فریب میں آکر خلافت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کرتے تو آج اسرائیل کا کہیں وجود نہ ہوتا۔“

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

حضرت مولوی محمد نبی محمدیؒ

گزشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر چھوٹے سے چوکھٹے میں یہ خبر نظر سے گزری کہ

افغانستان کے بزرگ عالم دین مولوی محمد نبی محمدیؒ انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اسے نیرنگیٔ زمانہ کا کرشمہ کہیے یا گردشِ حالات کا نتیجہ کہ مولوی محمد نبی محمدیؒ جیسے بزرگ عالم دین کی وفات پر چند سطروں کی ایک خبر کے بعد قومی پریس میں مکمل خاموشی کی کیفیت طاری ہے۔ ورنہ اگر یہی بات اچھے دنوں میں ہوتی تو نہ صرف افغانستان میں قومی سطح پر ان کا سوگ منایا جاتا بلکہ پاکستان میں بھی کئی دنوں تک ان کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ رہتا۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ کا تعلق افغانستان کی ولایت لوگر سے تھا اور وہ بلاشبہ اپنے دور میں افغانستان کے سرکردہ، ذہین ترین اور مدبر علماء میں سرفہرست تھے۔ مولوی محمد نبی محمدیؒ ان علماء میں سے تھے جنہوں نے افغانستان میں روسی اثرات کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی فکری مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور کمیونزم کے اثر و نفوذ سے افغانستان کو بچانے کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ وہ روسی افواج کی باقاعدہ آمد سے قبل اپنے علاقہ سے افغان پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور ایوان میں ببرک کرمل کے ساتھ اسلام اور کمیونزم کے حوالہ سے ان کے طویل پارلیمانی مباحثے افغان تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔ ان مباحثوں کی ایک مطبوعہ رپورٹ مولوی محمد نبی محمدیؒ نے خود مجھے ایک ملاقات میں دی تھی جن کا بیشتر حصہ پشتو یا فارسی میں ہونے کی وجہ سے میں ان سے پوری طرح استفادہ تو نہ کر سکا لیکن ایک تاریخی دستاویز کے طور پر وہ رپورٹ اب بھی میری فائلوں میں محفوظ ہوگی۔

مولوی صاحبؒ جید اور پختہ کار عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے والے زیرک راہنما اور حق بات کھلے بندوں کہنے اور حق کی خاطر عملی جدوجہد کے حوصلہ سے بہرہ ور لیڈر بھی تھے۔ مجھے ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا اور تفصیلی گفتگو ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ افغانستان کے جتنے علماء سے بھی اب تک ملا ہوں ان میں سب سے زیادہ مولوی محمد نبیؒ کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا۔ اور میں اپنے دوستوں کے حلقہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں ”افغانستان کا مفتی محمودؒ“ کہا کرتا تھا۔ وہ افغانستان میں روسی اثر و نفوذ کے خلاف شروع سے متحرک تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ”حرکت انقلاب اسلامی“ کے نام سے جماعت قائم کی تھی جو ایک دور میں افغانستان میں علماء کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ وہ اگر روسی فوجوں کی واپسی اور مجاہدین کی عبوری حکومت کے قیام کے بعد پروفیسر برہان الدین ربانی اور انجینئر حکمت یار کا راستہ روکنے کو ہی اپنا واحد

ہدف قرار دینے کی بجائے امن کا ماحول فراہم کر کے عام انتخابات کی کوئی صورت نکال لیتے تو میرا اندازہ تھا کہ اس وقت مولوی محمد نبی محمدیؒ کی ''حرکت انقلاب اسلامی'' اور انجینئر حکمت یار کی ''حزب اسلامی'' افغانستان کی دو سب سے بڑی پارٹیوں کی حیثیت سے سامنے آتیں۔ لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ تھا اور کابل کے کنٹرول پر احمد شاہ مسعود اور حکمت یار کی جنگ نے حالات کا رخ ایسا پلٹا کہ آج نہ صرف افغانستان بلکہ جنوبی ایشیا اور وسطی ایشیا کا سارا منظر تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستانی قافلہ کے ساتھ بھارت گئے۔ یہ قافلہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں تھا جبکہ مولوی محمد نبی محمدیؒ ایک عام فرد کے طور پر قافلہ میں شامل تھے جو خاموشی کے ساتھ گئے اور تقریبات میں شرکت کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس آ گئے۔ اس کے بعد مجھے ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے پشاور میں مولوی محمد نبی محمدیؒ کے ہیڈ کوارٹر میں ان سے تفصیلی انٹرویو کا موقع ملا جس میں افغانستان کی تاریخ، افغان معاشرہ میں علماء کے کردار، کمیونزم و لبرل ازم کے فروغ، روسی اثرات کے نفوذ، افغان علماء و عوام کے جہاد، آزادی اور افغانستان کے مستقبل کے حوالہ سے کئی گھنٹے گفتگو ہوئی۔

میں بہت سے افغان لیڈروں اور علماء سے ملا ہوں اور ان سے گفت و شنید کی ہے لیکن مولوی محمد نبی محمدیؒ جیسی معاملہ فہمی کسی اور میں نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ میرے نزدیک ان کی یہی انتہا درجہ کی معاملہ فہمی بہت سے مواقع پر ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ مولوی صاحب کے ساتھ اس کے بعد بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور قندھار پر طالبان کے قبضہ کے بعد جب مجھے قندھار جانے کا موقع ملا اس وقت تک کابل طالبان کے قبضہ میں نہیں آیا تھا اور احمد شاہ مسعود کے ساتھ طالبان حکومت کے مذاکرات کی تجویز ہو رہی تھی۔ تب مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص بھی قندھار میں تھے۔ میں ان سے ملا اور اس حوالہ سے گفتگو ہوئی، مولوی صاحبؒ کا موقف یہ تھا کہ ربانی حکومت اور طالبان کے درمیان مذاکرات کی ضرورت تو ہے لیکن حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس کی روشنی میں یہ نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ میں نے امیر المومنین ملا محمد عمر سے بھی مختصر ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا، ان کا مختصر ترین جواب دو لفظوں میں تھا کہ ''فائدہ نہیں ہے۔''

اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص "طالبان انقلاب" کے خاموش سرپرستوں میں سے ہیں اور طالبان کو مکمل سپورٹ کر رہے ہیں۔ لیکن ان دو بزرگ ترین شخصیات کو نئے نظام میں جو مقام ملنا چاہیے وہ انہیں نہیں مل رہا جس کے اثرات ان دونوں بزرگوں کی گفتگو میں بھی بین السطور محسوس ہو رہے تھے۔ طالبان راہنماؤں کے تقویٰ، خلوص، دیانت، ایثار، قناعت اور بہت سے حوالوں سے طالبان حکومت کی شاندار کامیابی کے باوجود فطری طور پر تصویر کا دوسرا رخ بھی موجود تھا اور ایسی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی موجودگی بھی ناگزیر تھی جو ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ میں اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں جس میں اس پہلو پر بھی گزارشات پیش کروں گا۔ البتہ اس موقع پر صرف اتنی بات عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبان قیادت اپنی صفوں سے باہر اپنے بہی خواہوں اور معاونین کی درجہ بندی نہیں کر سکی کہ کس کو کس مقام پر رکھنا ضروری ہے اور کس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ طالبان قیادت اپنے دوستوں اور بہی خواہوں کے جذبات، وسائل اور خدمات سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کر سکی جس کا اسے بہر حال نقصان ہوا۔ اور یہی بات مولوی محمد نبی محمدیؒ اور مولوی محمد یونس خالص کے حوالہ سے مجھے مسلسل کھٹکتی رہی۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ سے میں پاکستانی علماء کے اس وفد کے ساتھ بھی ملا جو عبوری صدر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی سے ملاقات اور انہیں مجاہدین کی حکومت کے قیام پر مبارک باد دینے کے لیے کابل گیا تھا۔ اس وقت مولوی محمد نبی محمدیؒ کو مجددی صاحب کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ سابق حکمران پارٹی کا ہیڈ کوارٹر ان کی تحویل میں تھا جسے انہوں نے "حرکت انقلاب اسلامی" کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت دے دی تھی۔ اور سیاسی معاملات میں ان کی ٹیم اور پارٹی سب سے زیادہ متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ پاکستانی علماء سے اسی ہیڈ کوارٹر میں ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے مفصل گفتگو کے بعد بہت سے سوالات کے جوابات بھی دیے۔ اس وقت میرا تاثر یہ تھا کہ مجددی حکومت کے داخلی معاملات پر مولوی محمد نبی محمدیؒ کا کنٹرول بڑھ رہا ہے اور وہ افغانستان کے مستقبل اور نئے نظام کے بارے میں بھی ایک واضح ذہن اور پروگرام رکھتے ہیں۔ وہ جس اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے اور مستقبل کے نقشہ کے حوالہ سے جو خطوط واضح کر رہے تھے اس میں میں میرے جیسے سیاسی کارکن کے لیے اطمینان اور تسلی کا بہت سا مواد موجود تھا۔ اور میں ذاتی طور پر اس اطمینان کے ساتھ ہی واپس آ رہا تھا کہ افغانستان

اب ایک متوازن اسلامی سیاسی نظام اور مستحکم حکومت کی طرف پیش رفت کرے گا اور افغانستان کی تعمیر نو اور اسلامی حیثیت کی بحالی کے عمل کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن اسی روز کابل میں ''حزب وحدت'' اور ''اتحاد اسلامی'' کے درمیان شدید گولہ باری سے نئی خانہ جنگی کا دور شروع ہو گیا جس نے ان توقعات اور امیدوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

مولوی محمد نبی محمدیؒ بیاسی سال کی عمر میں وفات پا چکے ہیں اور ان کی موت کی خبر پڑھ کر ماضی کی یادوں کا ایک طویل اور متنوع سلسلہ ذہن کی سکرین پر یکے بعد دیگرے ابھر رہا ہے۔ مجھے مولوی صاحبؒ کی وفات کے غم کے ساتھ ساتھ یہ غم بھی ستا رہا ہے کہ ان کے علم وفضل، فہم وتدبر اور حکمت و دانش سے دشمنوں نے ضرور زک اٹھائی مگر ان کے دوست کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور افغانستان کے بارے میں ان کی نیک تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کی کوئی سبیل پیدا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲ مئی ۲۰۰۲ء)

ایمل کانسی شہید

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمان نے میر ایمل کانسی شہید کے گھر جا کر اور اس کے خاندان سے تعزیت کر کے پورے ملک کے علماء کرام اور دینی حلقوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے، ورنہ یہ ملک کے ہر عالم دین اور دینی کارکن کے ذمے تھا کہ وہ میر ایمل کانسی شہید کے گھر جا کر اس خاندان سے تعزیت کرتا اور ایمل کانسی شہید کے بھائیوں کو یقین دلاتا کہ ان کے دلیر اور جرأت مند بھائی نے جس حوصلے اور استقامت کے ساتھ قومی خود مختاری اور ملک کی آبرو کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس پر قوم کا ہر باغیرت شخص فخر کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایمل کانسی شہید نے جھکنے اور کمزوری دکھانے کے بجائے آبرومندانہ طریقے سے جام شہادت نوش کر کے نہ صرف پاکستانی عوام کو ایک نئے حوصلے سے نوازا ہے بلکہ امریکی استعمار کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ پاکستان کے غیرت مند نوجوان اس کے جبر وتشدد کے ہتھکنڈوں سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے دین کی سربلندی، ملک کی سالمیت اور قوم کی خود مختاری کے لیے پہلے سے زیادہ عزم اور جذبے سے سرشار ہیں۔

ایمل کانسی کو میاں نواز شریف حکومت کے دور میں ڈیرہ غازی خان کے ایک ہوٹل سے اغوا کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا گیا تھا جہاں اس پر اس الزام میں مقدمہ چلا کہ اس نے چند سال قبل امریکہ میں قیام کے دوران سی آئی اے کے دو اہل کاروں کو قتل کر دیا تھا۔ اس الزام میں اس پر مقدمہ چلا اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق موت کی سزا سے پہلے ایمل کانسی مرحوم نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور آخر میں کلمہ طیبہ زبان سے دہرایا جس کے بعد زہر کا ٹیکہ لگا کر اسے موت کی نیند سلا دیا گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق سزائے موت سے قبل اپنے آخری انٹرویو میں میر ایمل کانسی شہید نے کہا کہ اس نے جو کچھ کیا، وہ ان امریکی مظالم کا ردعمل تھا جو امریکہ پورے عالم اسلام بالخصوص فلسطین میں جاری رکھے ہوئے ہے اور امریکی سی آئی اے مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف ہے۔ اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ ظالموں کے ظلم و جبر کے ردعمل میں ہتھیار اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس نے جو کچھ کیا ہے، اس پر اسے کوئی ندامت نہیں ہے۔

میر ایمل کانسی نے امریکی سی آئی اے کے اہل کاروں کو کس مقصد سے قتل کیا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا، یہ بات واضح نہیں ہے، لیکن شہید کے انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کے اسلام دشمن طرز عمل اور پالیسیوں کے خلاف عالم اسلام میں ابھرنے والے ردعمل کا حصہ ہے اور اس کے قلب و ذہن میں وہی جذبات و خیالات کار فرما رہے ہیں جو عالم اسلام کے مختلف حصوں میں امریکی پالیسیوں کے خلاف مسلمانوں کی غیرت و حمیت کے اظہار کا عنوان بن گئے ہیں۔

میر ایمل کانسی شہید کو جس انداز سے ڈیرہ غازی خان سے گرفتار کیا گیا وہ اپنی جگہ خود ایک مسئلہ ہے۔ اس پر پاکستان کے قومی اور دینی حلقوں کی طرف سے جذبات کا اظہار کیا گیا اور اس کا مکمل ترین اظہار قومی اسمبلی میں اس وقت سامنے آیا جب بلوچستان سے قومی اسمبلی کے رکن حافظ حسین احمد نے میر ایمل کانسی شہید کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوئے اپنی دعا میں یہ جملے شامل کیے کہ "یا اللہ! ایمل کانسی کو امریکہ کے حوالے کرنے والوں کا بیڑہ غرق فرما"۔ یہ الفاظ حافظ حسین احمد کے تھے اور اس کے پیچھے پوری قوم کے جذبات تھے۔ اس لیے امریکہ پر یہ بات اب پوری طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ عالم اسلام میں امریکی پالیسیوں کے خلاف مسلم نوجوانوں کے جائز اور فطری ردعمل کو جبر کے ذریعے دبانے

اور تشدد کے ذریعے باغیرت مسلمانوں کے منہ بند کرنے کے سارے حربے ناکام ہوگئے ہیں اور یہ حربے تاریخ کے کسی بھی دور میں کامیاب نہیں ہوئے۔ زندہ قوموں کو ان کے ایمان وعقیدہ، آزادی و خود مختاری اور جذبات واحساسات سے نہ اس سے قبل کبھی طاقت اور جبر کے ذریعے محروم کیا جاسکا ہے اور نہ اب کسی طاقت کے ذریعے کرنا ممکن ہے۔ امریکہ کو اسی سے اندازہ کرلینا چاہیے کہ جس شخص کو اس نے مجرم قرار دیا اور اپنے قانونی نظام کے تحت مجرم ثابت کردیا اور عدالتی سسٹم کے ذریعے اسے موت کی سزا دلوادی، سزایافتہ قاتل جب تدفین کے لیے اپنے وطن پہنچا تو وہ قوم کا ہیرو قرار پایا ہے، قومی اسمبلی میں اس کے لیے دعائے مغفرت ہوئی ہے، بلوچستان کے گورنر نے اس کے گھر جاکر اس کے خاندان سے تعزیت کی، لاکھوں مسلمانوں نے اس کی میت کا استقبال کیا اور کم وبیش قوم کے ہر طبقے کی طرف سے اس کی سزائے موت کے خلاف غم وغصے کا اظہار کیا گیا ہے۔

(۲۷ نومبر ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

ممتاز محقق، دانش ور اور مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ گزشتہ دنوں فلوریڈا (امریکا) میں انتقال کرگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا علمی تعلق جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے تھا، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے تلامذہ میں سے تھے اور جامعہ عثمانیہ کے علمی وتحقیقی کاموں میں ایک عرصہ تک شریک رہے۔ حیدر آباد پر بھارت کے قبضہ کے بعد پاکستان آگئے اور پھر یہاں سے فرانس کے دار الحکومت پیرس چلے گئے جہاں انہوں نے طویل عرصہ تک اسلام کی دعوت واشاعت کے حوالہ سے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور بے شمار لوگوں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ بہت سے فرانسیسی باشندوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ وہ بنیادی طور پر تعلیم وتحقیق کی دنیا کے آدمی تھے اور انہوں نے ساری زندگی لکھنے پڑھنے کے ماحول میں گزار دی۔ فقیر منش اور قناعت پسند بزرگ تھے، کتاب زندگی بھر ان کی ساتھی رہی اور کتاب ہی کی خدمت میں وہ آخر دم تک مصروف رہے۔

وفات کے وقت ان کی عمر ۸۸ برس کے لگ بھگ تھی۔ راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں، جو

ماہنامہ الشریعہ (فروری ۹۱ء) میں شائع ہو چکا ہے، انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی ولادت محرم الحرام ۱۳۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ ان کی متعدّد علمی وتحقیقی تصانیف ہیں جن سے اہل علم ایک عرصہ سے استفادہ کر رہے ہیں اور ان کی بعض تصانیف متعدّد یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے سیرت نبوی کے سیاسی پہلوؤں اور اسلام کے اجتماعی نظام کے حوالے سے نمایاں علمی خدمات سرانجام دیں۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی اور دور نبوت کے سیاسی وثائق کے حوالے سے ان کا علمی کام اہل علم کے لیے گراں قدر تحفہ ہے اور انہوں نے ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' کی تلاش وتحقیق اور طباعت کا اہتمام کر کے منکرین حدیث کے اس اعتراض کا عملی جواب دیا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں احادیث کی جمع وترتیب کا کام نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے پاکستان میں اسلامی قوانین کی ترتیب وتدوین کے حوالہ سے بھی مختلف اوقات میں خدمات سرانجام دیں۔ سیرت نبوی کے مختلف عنوانات پر بہاول پور اسلامی یونیورسٹی میں ان کے خطبات نے بہت مقبولیت حاصل کی جو ''خطبات بہاول پور'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اور ''رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی'' کے عنوان سے ان کی محققانہ تصنیف کو بھی اہل علم کے ہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہر وسیع المطالعہ محقق کی طرح وہ بھی مختلف مسائل پر جداگانہ رائے رکھتے تھے اور ان کے تفردات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے لیکن اپنی رائے پر اڑنے اور ہر حال میں اس کا دفاع کرنے کے بجائے وہ غلطی ظاہر ہونے پر اسے تسلیم کرتے تھے اور اپنی رائے سے رجوع میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مغربی دانش وروں کی طرف سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے جانے والے اعتراضات میں ایک یہ بھی ہے کہ جب قرآن کریم میں چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی صریحًا ممانعت آگئی اور اس کے مطابق آنحضرتؐ نے متعدّد صحابہ کرام کو، جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، حکم دیا کہ وہ زائد بیویوں کو الگ کر دیں تو خود آپؐ نے بیک وقت نو بیویاں کیوں رکھیں اور قرآنی ضابطہ کے مطابق ان میں سے چار سے زائد بیویوں کو الگ کیوں نہیں کر دیا؟ اس کے جواب میں جمہور علما یہ کہتے ہیں کہ یہ حضورؐ کی خصوصیات میں سے ہے اور آپؐ کو اس کی خاص اجازت دی گئی تھی۔ اس کی بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ باقی صحابہ کرام نے چار سے زائد جن بیویوں کو اپنی زوجیت سے

الگ کیا، ان کے تو دوسری جگہ نکاح ہوگئے اور وہ نئے گھروں میں آباد ہوگئیں لیکن جناب رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کے ساتھ آنحضرتؐ کے بعد کسی امتی کا نکاح قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں اس لیے اگر آپؐ بھی چار سے زیادہ بیویوں کو الگ کر دیتے تو وہ بے سہارا ہو جاتیں اور ان کا کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہتا جو امت کی ماؤں کے حوالہ سے بہت سنگین بات ہوتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرمؐ کو تمام بیویاں اپنے نکاح میں باقی رکھنے کی بطور خاص اجازت دے دی۔

مگر ڈاکٹر حمید اللہ نے ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے سہ ماہی عربی مجلہ ''الدراسات الاسلامیۃ'' کے محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۰ھ کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں یہ موقف اختیار کیا کہ جناب رسول اللہؐ نے قرآن کریم کے مذکورہ حکم کے بعد حقوق زوجیت کے ساتھ تو صرف چار بیویوں کو باقی رکھا اور پانچ بیویوں کو ''اعزازی بیویوں'' کی حیثیت دے دی جو آپؐ کی بیویاں تو سمجھی جاتی تھیں مگر انہیں ''حقوق زوجیت'' حاصل نہیں تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مغربی دانش وروں کے اعتراض کا اپنے طور پر جواب دینے کی کوشش کی۔

ہم نے ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ میں اس پر گرفت کی اور اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں پروفیسر عبد الرحیم ریحانی کا مضمون شائع کیا جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اس موقف کی دلائل کے ساتھ تردید کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے جواب میں ہمیں مضمون بھجوایا جس میں انہوں نے اپنے موقف کو دہراتے ہوئے اس کے حق میں دلائل دیے۔ ہم نے وہ مضمون دسمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شائع کر دیا اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کے موقف اور دلائل پر اطمینان نہیں ہے اور ہم اس کا علمی و تحقیقی جواب دیں گے۔ اس دوران ماہنامہ ''صدائے اسلام'' پشاور نے بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف پر گرفت کی جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ''صدائے اسلام'' کے مدیر محترم کے نام مکتوب میں اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ میں نے صرف اہل مغرب کے ایک اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی تھی، اگر جمہور علما کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو مجھے بھی اپنے موقف پر اصرار نہیں اور میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ مکتوب ''صدائے اسلام'' کے حوالے سے ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ کے مارچ ۱۹۹۱ء کے شمارے میں شائع کیا اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی حق پرستی اور فراخ دلی کا اعتراف کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تفردات ہر صاحب علم اور محقق کا حق ہے۔ جو بھی مطالعہ کرے گا، تحقیق کرے گا اور کسی مسئلہ پر متنوع علمی مواد کو سامنے رکھ کر اپنی رائے قائم کرے گا، اس کی رائے کسی نہ کسی مسئلہ پر باقی علما سے مختلف ہو جائے گی۔ یہ فطری بات ہے البتہ اہل علم کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور کسی مرحلہ پر اپنی رائے کی غلطی ان پر واضح ہو جائے تو وہ اسے رجوع میں بھی کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے۔ یہ بات محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب میں بھی ہم نے دیکھی ہے جو ان کے خلوص، للّٰہیت اور قبول حق کے جذبہ کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے عمر بھر علمی و تحقیقی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا اور ایک دنیا نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ہم خود ان کے خوشہ چینوں اور ان کی تحقیقات سے استفادہ کرنے والوں میں شامل ہیں اس لیے مجھے ان کی وفات پر ذاتی طور پر یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے کسی شفیق استاذ کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایک عالم، محقق، دانش ور اور صاحب فضل و کمال شخصیت کی موت پر اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی وفات بلا شبہ پورے عالم اسلام کے لیے صدمہ کا باعث ہے اور علمی دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی و دینی خدمات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۰۲ء)

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم

نواب زادہ نصر اللہ خان بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور عالم رنگ و بو میں ۸۵ برس گزار کر دار بقا کی طرف کوچ کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ گزشتہ ماہ امریکا آنے سے قبل میں نوابزادہ صاحب مرحوم سے لاہور میں ان کے دفتر میں ملا تھا۔ میں پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا قاری جمیل الرحمان اختر کے ہمراہ تھا، انہوں نے پاکستان جمہوری پارٹی کے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے گاڑی روک لی تھی کہ نوابزادہ صاحب اگر موجود ہوں تو ان سے ملاقات کر لیتے ہیں۔ مجھے نوابزادہ صاحب سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے بھی ہاں کر دی۔ مگر جب ہم دفتر میں ان کے کمرہ

کی طرف بڑھے تو بجلی غائب ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا تھا اور نوابزادہ نصر اللہ خان چند احباب کے جلو میں اندھیرے اور گرمی کے ماحول میں بیٹھے تھے۔ ہم نے مصافحہ کر کے تعارف کرایا تو بہت خوش ہوئے۔

میری ان سے پرانی یاد اللہ تھی۔ پاکستان قومی اتحاد کے دور میں صوبائی سطح پر پہلے نائب صدر اور پھر سیکرٹری جنرل کے طور پر مجھے دو تین سال کام کرنے کا موقع ملا۔ ہمارا صوبائی دفتر نوابزادہ نصر اللہ خان کے دفتر کے ایک کمرہ میں ہوتا تھا اور اجلاس وغیرہ بھی وہیں ہوا کرتے تھے۔ اس دوران نوابزدہ صاحب مرحوم کے ساتھ خلوت و جلوت کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ حمزہ صاحب، اقبال احمد خان مرحوم، رانا نذر الرحمن، سید معین الدین، ملک محمد اکبر ساقی مرحوم، صاحبزادہ فیض القادری مرحومؒ، مولانا فتح محمد، اور خاکسار رہنما چودھری محبت علی صاحب صوبائی ٹیم کے اہم ارکان تھے، اور ہمارا تحریکی مصروفیات کا زیادہ وقت نوابزدہ مرحوم کے زیر سایہ ہی گزرتا تھا۔

نوابزادہ صاحب نے اس آخری ملاقات میں بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کیا۔ گوجرانوالہ کے حوالے سے پوچھا کہ کیا آپ ابھی اسی مسجد میں ہیں جہاں میں نے ایک دفعہ خطاب کیا تھا؟ میں نے ہاں میں جواب دیا تو اس دور کی بعض باتوں کا تذکرہ کرنے لگے۔ میرے بارے میں ان کے ذہن میں تھا کہ زیادہ وقت لندن میں رہتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ نہیں صرف تعطیلات کے دوران بیرون ملک جاتا ہوں، باقی سارا سال گوجرانوالہ میں ہی ہوتا ہوں۔ البتہ تدریسی مصروفیات بڑھ جانے کی وجہ سے عملی سرگرمیوں میں زیادہ شرکت نہیں ہو پاتی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ دستور کی بحالی اور ایل ایف او کے خاتمہ کی جس جدوجہد میں وہ مصروف ہیں کیا اس میں کامیابی کی کوئی توقع ہے؟ فرمانے لگے کہ بالکل ہوگی اور ہم ڈکٹیٹر شپ سے ضرور نجات حاصل کر لیں گے، اس لیے کہ ہم سیاسی کارکن ہیں اور سیاسی کارکن ہر قسم کے حالات میں اپنی جدوجہد جاری رکھتا ہے اور کسی صورت میں بھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔

آدھ پون گھنٹے کی اس نشست بلکہ زندگی کی آخری ملاقات کے بعد جب ہم نے نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم سے رخصت چاہی تو الوداع کہنے کے لیے کھڑے ہونے لگے۔ میں نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ آپ بزرگ ہیں بیٹھے رہیں اور اٹھنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ مگر یہ کہتے ہوئے میرا ہی سہارا لے کر

کھڑے ہوگئے کہ مجھے یہ تاثر نہ دیں کہ میں اب کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کپکپاتے جسم، لرزتے ہاتھوں اور مسلسل ہلتی ہوئی گردن کے ساتھ ان کے اس عزم اور آواز کے لہجے نے دل و دماغ کو جس کیفیت سے دوچار کیا اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے بس میں نہیں، اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ آواز دل کے کسی کونے سے ضرور ابھرتی ہے کہ پچاسی سالہ بوڑھے کا یہ حوصلہ اور عزم ہم جیسوں کے لیے قابل رشک بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

یہ نوابزادہ صاحب مرحوم کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی جس کے مناظر زندگی بھر ذہن کی سکرین پر بار بار جھلملاتے رہیں گے۔ اس کے بعد اخبارات میں ان کی خبریں پڑھتے رہے۔ ان کے برطانیہ، سعودی عرب اور دوبئی جانے کی خبریں نظر سے گزریں، اور پاکستان میں جمہوری اقدار اور دستور کی بحالی کے لیے ان کی سرگرمیاں اور بھاگ دوڑ سامنے آتی رہی۔ اس دوران گزشتہ روز ڈمفریز ورجینیا امریکا میں ایک عزیز کے ہاں انٹرنیٹ پر پاکستانی اخبارات کی خبریں دیکھنا چاہیں تو اس خبر نے نگاہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا کہ ''بزرگ سیاستدان نوابزادہ نصر اللہ خان کی میت ان کے آبائی گاؤں پہنچادی گئی''۔ دل دھک سے رہ گیا اور زبان پر بے ساختہ اناللہ وانا الیہ راجعون جاری ہوگیا۔ انٹرنیٹ آپریٹ کرنے والے عزیز کو خبر کی تفصیلات تلاش کرنے کے لیے کہا تو چند لمحوں میں نوابزادہ صاحب کی بیماری، وفات اور ان کی موت پر ملک بھر میں بچھ جانے والی صف ماتم کی تفصیلات آنکھوں کے سامنے تھیں۔

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم ہمارے دور کے سیاستدان نہ تھے۔ اس لیے ان کی بہت سی باتوں کو سمجھنا آج کی نسل کے لیے مشکل ہے۔ وہ اس ٹیم کے آخری اور باقی ماندہ فرد تھے جس نے آزادی کی جنگ لڑی اور آزادی کا پروانہ مل جانے کے بعد اس کے تحفظ اور بقا کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ وہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی ٹیم کے آدمی تھے۔ انہوں نے مجلس احرار اسلام کے پلیٹ فارم سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ تقسیم ہند سے قبل وہ آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری جنرل تھے اور برطانوی استعمار کے تسلط سے وطن عزیز کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ وہ معروف معنوں میں نواب اور نوابزادہ تھے اور زندگی بھر اسی لقب سے پکارے جاتے رہے۔ جبکہ مجلس احرار اسلام کی سیاست اس دور میں ''نواب دشمنی'' سے عبارت تھی۔ احرار کے سیاسی مزاج کے بارے میں اس دور میں یہ کہا جاتا تھا کہ کسی احراری کی جیب میں پانچ روپے ہوں تو وہ سوچنے لگ جاتا

ہے کہ کون سی ریاست کے نواب کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔ اس لیے ایک عرصہ تک میرے ذہن میں بھی یہ الجھن رہی کہ احرار جیسی ''نواب دشمن'' جماعت میں نصر اللہ خان جیسے ''نواب زادہ'' کا سیکرٹری جنرل کے منصب تک رسائی حاصل کر لینا آخر کیسے ممکن ہوا؟ مگر جب انہیں قریب سے دیکھا بلکہ بہت ہی قریب سے دیکھا تو بات سمجھ میں آگئی کہ ''نواب زادہ'' کے لقب کی چادر تو انہوں نے ویسے ہی تان رکھی ہے، اس کے اندر جھانک کر دیکھیں تو ایک ایسے فقیر منش، عوام دوست، اور درویش صفت سیاستدان سے ملاقات ہوتی ہے کہ فقر و درویشی کو بھی اس ''نوابی'' پر رشک ہونے لگے۔

وہ نہ صرف نماز روزہ کے پابند تھے اور حلال و حرام کا اہتمام کے ساتھ فرق کرنے والے تھے بلکہ میں ان کی شب زندہ داری اور تہجد گزاری کا بھی شاہد ہوں۔ انہوں نے دینی تحریکات کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے اور ختم نبوت کے تحفظ کی جدوجہد میں تو ان کا کردار ہمیشہ قائدانہ رہا ہے۔ انہیں اگر کسی دینی تحریک کے کسی پہلو سے اختلاف بھی ہوا ہے تو اس کا اظہار انہوں نے درون خانہ کیا ہے۔ برسرعام ایسے کسی اختلاف کے اظہار سے وہ گریز کرتے تھے جس سے دینی تحریک کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو۔ وہ معروف معنوں میں خالصتًا ایک سیاسی رہنما تھے۔ ان کا شمار دینی رہنماؤں میں نہیں ہوتا تھا لیکن میں نے متعدّد دینی تحریکات کے رہنماؤں کو اپنی جدوجہد کے حوالہ سے ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور انہیں دینی رہنماؤں کو تحریکوں کے داؤ پیچ سکھاتے ہوئے پایا ہے۔

مجھ سے اگر کوئی نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کی تین بڑی خصوصیات بیان کرنے کے لیے کہے تو میری گزارش یہ ہوگی کہ

1. وہ اسلام اور پاکستان کے ساتھ اس قدر دوٹوک اور واضح کمٹمنٹ رکھتے تھے کہ ان دو حوالوں سے کوئی ڈھیلی بات سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔
2. عوام کے حق حکمرانی اور جمہوری اقدار کی سربلندی پر وہ اس درجہ کا یقین رکھتے تھے کہ ساری زندگی انہوں نے اسی کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گزار دی۔
3. اور ان کی استعمار دشمنی کا یہ عالم تھا کہ سیاسی زندگی کا آغاز انہوں نے برطانوی استعمار کے تسلط سے آزادی کی جدوجہد سے کیا اور ان کی ۸۵ سالہ زندگی کا اختتام امریکی استعمار کے تسلط کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے ہوا۔ انہوں نے افغانستان اور عراق پر امریکی یلغار اور

پاکستان کے معاملات میں امریکی مداخلت کے خلاف جس بلند آہنگی کے ساتھ آواز اٹھائی وہ پاکستان اور عالم اسلام کے دیگر سیاست دانوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام، پاکستان، جمہوریت اور عالم اسلام کے لیے ہر قسم کی مصلحتوں سے بالاتر ہو جایا کرتے تھے اور ان معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت روا رکھنے کے قائل نہیں تھے۔

نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم فرشتہ نہیں تھے، انسان تھے۔ ان سے یقیناً بہت سی غلطیاں ہوئی ہوں گی اور ان کی بہت سی باتوں سے لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا۔ خود ہمیں بھی ان کی بعض باتوں سے اختلاف تھا لیکن اسلام اور پاکستان کے ساتھ ان کی محبت اور اسلامی و جمہوری اقدار کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اور اپنے مشن اور فکر و عقیدہ کے لیے جدوجہد میں ان کا حوصلہ و عزم اور استقلال و استقامت آنے والی نسلوں کے لیے یقیناً مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ

(۱)

مولانا شاہ احمدؒ نورانی کی وفات کی خبر میں نے اسلام آباد میں سنی۔ جی ٹین تھری میں واقع جامعہ صدیقہ للبنات میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریب تھی، جامعہ کے مہتمم مولانا عبد الرشید کے ارشاد پر طالبات کو پہلا سبق پڑھایا۔ اس کے بعد اسلام آباد کے سرکردہ علماء کرام مولانا قاری محمد نذیر فاروقی، مولانا محمد رمضان علوی، مولانا پروفیسر ڈاکٹر احمد جان اور دیگر حضرات کے ساتھ ہم کھانے کے دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ مولانا محمد رمضان علوی کو ان کے کسی دوست نے فون پر اطلاع دی کہ مولانا شاہ احمد نورانیؒ کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خبر سنتے ہی محفل سوگوار ہوگئی اور مولانا نورانیؒ کی زندگی اور خدمات کے حوالہ سے مختلف امور کا تذکرہ ہونے لگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر مجھے ایک دو جگہ جانا تھا، اس دوران معلومات حاصل کرتے رہے اور کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں۔

خیال تھا کہ اگر اسلام آباد میں جنازہ ہو تو اس میں شرکت ہو جائے۔ مگر پتہ چلا کہ میت کراچی لے جائی جا رہی ہے اور جنازے کا پروگرام کراچی میں ہی ہے، چنانچہ سوگوار دل کے ساتھ شام کو گوجرانوالہ واپس چلا آیا۔

مولانا شاہ احمدؒ نورانی کا نام پہلی بار ۱۹۷۰ء میں سنا جب وہ کراچی سے جمعیۃ علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے قومی سیاست کے افق پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس وقت جمعیۃ علماء پاکستان کے سربراہ سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ تھے۔ لیکن اس کے بعد مولانا نورانیؒ کو جے یو پی کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ آخر عمر تک اس منصب کے ساتھ قومی سیاست میں متحرک کردار ادا کرتے رہے۔

جمعیۃ علماء پاکستان کے نام سے سیاسی جماعت سب سے پہلے دیوبندی مکتب فکر کے جمعیۃ علماء ہند سے تعلق رکھنے والے علماء نے قائم کی تھی۔ اس کے سرکردہ علماء کرام میں حضرت مولانا محمد صادقؒ آف کھڈہ کراچی، حضرت مولانا عبد الحنانؒ آف راولپنڈی، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ، حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ آف سرحد، حضرت مولانا مفتی ضیاء الحسن لدھیانویؒ آف ساہیوال اور حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ آف گوجرانوالہ شامل تھے۔ یہ سب جمعیۃ علماء ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں کام کرنے والی جمعیۃ علماء اسلام کا جمعیۃ علماء ہند سے تحریک پاکستان کی حمایت یا مخالفت کے مسئلہ پر اختلاف تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا حضرات نے جمعیۃ علماء پاکستان کے نام سے ایک تنظیم قائم کر کے اپنے رفقاء کو منظم کرنا چاہا مگر اس وقت کے حالات میں وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ میں نے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ سے متعدّد بار اس کا تذکرہ سنا ہے اور ان کے کاغذات میں اس جمعیۃ کی کچھ کاروائیاں بھی دیکھی ہیں۔ مگر دیوبندی مکتب فکر کی جمعیۃ علماء پاکستان متحرک نہ ہو سکی اور بریلوی مکتب فکر نے جمعیۃ علماء پاکستان کے نام سے تنظیم قائم کر کے کام شروع کر دیا۔ تب سے یہ پلیٹ فارم بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی سیاسی تگ و تاز کے لیے مخصوص ہے۔

ایک دور میں جمعیۃ علماء پاکستان کے سربراہ آلو مہار شریف ضلع سیالکوٹ کے سجادہ نشین صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ تھے۔ وہ قیام پاکستان سے قبل مجلس احرار اسلام میں شامل رہے ہیں اور ان کا شمار احرار

کی صف اول کی قیادت میں ہوتا تھا۔ ان کی رہائش گوجرانوالہ میں تھی اور حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کا ان کے ساتھ دوستانہ تعلق تھا۔ اس لیے مجھے بھی ان کے پاس حاضر ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا اور نیاز مندی کا یہ تعلق آخر وقت تک رہا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل ان کی بجائے حضرت خواجہ قمرالدین سیالویؒ کو جے یو پی کا سربراہ چنا گیا۔ الیکشن کے بعد جب قومی اسمبلی میں جمعیۃ علماء پاکستان کے سات منتخب ارکان پر مشتمل پارلیمانی گروپ مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی سربراہی میں قائم ہوا تو ان کی صلاحیتوں اور ابھرتی ہوئی شخصیت کے پیش نظر جے یو پی کی صدارت کا منصب بھی انہیں کو سونپ دیا گیا۔ جے یو پی کے تنظیمی محاذ پر انہیں مولانا عبدالستار خان نیازیؒ کی رفاقت میسر آئی جن کا شمار تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں ہوتا تھا اور وہ اس سے پہلے پنجاب اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ مولانا نیازیؒ اس سے قبل تحریک خلافت کے عنوان سے سیاسی میدان میں متحرک رہے تھے لیکن الیکشن میں جے یو پی کی نمایاں پیش قدمی کے بعد وہ مولانا نورانیؒ کے ساتھ میدان میں اترے اور دونوں کی مسلسل اور پرخلوص جدوجہد نے جمعیۃ علماء پاکستان کو چند سرکردہ علماء اور مشائخ کے حلقہ ہائے ارادت کے دائرہ سے نکال کر ایک عوامی سیاسی جماعت کا رنگ دے دیا۔

مولانا شاہ احمد نورانیؒ میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے والد محترم مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ کا شمار مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے خلفاء میں ہوتا تھا اور ان کی پیری مریدی کا سلسلہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ یورپ اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ مولانا نورانیؒ کی شادی مدینہ منورہ میں مولانا فضل الرحمان مدنیؒ کے خاندان میں ہوئی۔ مولانا نورانیؒ کو اردو، انگریزی اور عربی کے علاوہ فارسی، فرانسیسی، سواحلی اور دیگر متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور ۷۰ء کے الیکشن سے قبل ان کی تگ و تاز کا میدان دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے والد مرحوم کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے وسیع دائرہ میں پھیلا ہوا تھا جس میں خود مولانا نورانیؒ کی مساعی سے بھی خاصا اضافہ ہوا۔ مگر ان کے اصل جوہر قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد پارلیمانی محاذ پر کھلے اور انہوں نے بہت جلد ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹرین کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرا لیا۔

اس وقت قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد پہلے خان عبدالولی خان اور پھر ان کی گرفتاری

کے بعد مولانا مفتی محمودؒ تھے جبکہ اپوزیشن میں ان کے ساتھ مولانا نورانیؒ ایک متحرک، مدبر اور صاف گو رہنما کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری اور پھر تحریک ختم نبوت میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور دستور میں اسلامی دفعات کو شامل کرانے اور پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے دستوری تحفظ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ خان عبد الولی خان جلد گرفتار ہو کر جیل میں چلے گئے تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد بچے کھچے پاکستان کو سنبھالنے، ایک متفقہ دستور دینے، اور دستور میں اسلام کی بنیادی دفعات کو سمونے میں اس دور کی مختصر اپوزیشن نے جو شاندار کردار ادا کیا اس میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، پروفیسر غفور احمدؒ اور چودھری ظہور الٰہیؒ کا کردار ملک کی دستوری تاریخ میں ہمیشہ پاکستانی قوم کے محسنوں کے طور پر ذکر ہوتا رہے گا۔

۱۹۷۴ء میں جب ملک میں قادیانی گروہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک چلی تو اسی اپوزیشن نے قومی اسمبلی کا محاذ سنبھالا اور اپنے اتحاد اور مشترکہ جدوجہد کی وجہ سے یہ مورچہ بھی سر کر لیا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں اپوزیشن تعداد کے لحاظ سے اگرچہ بڑی نہیں تھی لیکن مذکورہ بالا بھاری بھر کم شخصیات اور ان کے بے داغ کردار نے اسے ایک طاقتور اپوزیشن کی حیثیت دے دی تھی۔ اور اپوزیشن کو یہ مقام دلوانے میں مولانا نورانیؒ کا کردار بھی نمایاں تھا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل جب ملک کی نو سیاسی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے مشترکہ پلیٹ فارم قائم کیا تو اس کے سربراہ مولانا مفتی محمودؒ تھے جبکہ مولانا نورانیؒ کی جمعیۃ علماء پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب رفیق احمد باجوہ کو قومی اتحاد کا سیکرٹری چنا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لیے قومی اتحاد کی انتخابی مہم اور پھر انتخابات میں دھاندلی کے خلاف عوامی جدوجہد کو منظم کرنے میں مولانا نورانیؒ نے سرگرم کردار ادا کیا۔ قومی سیاست میں ان کی پختہ کاری اور عزم و استقامت کا ایک مظاہرہ اس وقت سامنے آیا کہ جب پاکستان قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کے دوران جو عوام کے دینی جذبات کی وجہ سے تحریک نظام مصطفیٰ کا عنوان اختیار کر چکی تھی، قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل اور مولانا نورانیؒ کے رفیق کار جناب رفیق احمد باجوہ نے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ خفیہ ملاقات کی تو مولانا نورانیؒ نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ انہوں نے اپنے اس پرانے رفیق کی قربانی دینے میں ایک لمحہ کی

تاخیر نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس نازک مرحلہ میں مولانا نورانیؒ اپنے اس رفیق کے لیے تھوڑی سی لچک بھی دکھا دیتے تو قومی اتحاد اور تحریک نظام مصطفیٰؐ دونوں کا شیرازہ بکھر جاتا۔ لیکن انہوں نے تحریک اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنے سیکرٹری جنرل کی قربانی دے کر اصول پرستی، بیداری اور استقامت کا شاندار مظاہرہ کیا اور ان کا یہ کردار تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

مولانا نورانیؒ نے ۷۸ برس عمر پائی ہے اور ۱۹۷۰ء سے اب تک وہ قومی سیاست کا ایک متحرک کردار رہے ہیں۔ قومی اسمبلی اور سینٹ دونوں کے باری باری رکن رہے ہیں۔ ان کے حلقہ ارادت کا دائرہ دنیا کے کئی براعظموں تک وسیع ہے۔ وہ جوہر شناس تھے اور ہیروں کا کاروبار کرتے تھے۔ دولت کے حصول اور پر تعیش زندگی کے اسباب کبھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے سادہ زندگی گزاری ہے۔ میں نے کراچی صدر میں ان کی اس رہائش گاہ میں متعدّد بار حاضری دی ہے جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ان کا مسکن رہی ہے۔ یہ ایک فقیر منش عالم دین کی رہائش گاہ تھی جو کرائے کے فلیٹ میں تھی۔ ان کا رہن سہن کا انداز پرانے وضعدار اور باوقار علماء کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اور ان کی مہمان نوازی اور ملنساری کے نقوش ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا پہلو نمایاں تھا۔ موقع محل کے مطابق ہلکے پھلکے فقرے چست کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا اور وہ لمحوں میں کسی بھی محفل کو زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ لیکن تہذیب و شائستگی کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا جس کی شہادت کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ان کے ایک بڑے سیاسی حریف کی بیٹی جو خود بھی ان کی شدید سیاسی تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہیں، یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان کی وفات پر جو تعزیتی بیان دیا ہے اس میں اس بات کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے کہ مولانا نورانیؒ اختلاف کا اظہار اور تنقید تہذیب کے دائرے میں رہ کر کیا کرتے تھے۔

مولانا نورانیؒ مسلکاً بریلوی تھے اور ڈھیلے ڈھالے نہیں بلکہ متصلب اور پختہ کار بریلوی تھے۔ اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جہاں بھی مسلک کی بات آئی ہے ان میں کوئی لچک دیکھنے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود مشترکہ دینی معاملات میں انہوں نے مشترکہ جدوجہد اور رابطہ و معاونت سے کبھی گریز نہیں کیا۔ سیاسی معاملات ہوں یا دینی، ملک کی مختلف الخیال جماعتوں اور حلقوں کے درمیان رابطہ و مفاہمت کے فروغ اور اتحاد و اشتراک کے اہتمام میں ان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت، افغانستان کی قومی خود مختاری و آزادی کے تحفظ، امریکہ کی استعماری یلغار کی مخالفت، اور پاکستان کے قومی اور داخلی معاملات میں امریکی مداخلت کی مذمت و مزاحمت میں انہوں نے جو شاندار کردار ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کے ایک مستقل باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی دینی قوتوں نے متحدہ مجلس عمل کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کیا تو اس کی سربراہی کے لیے سب سے نمایاں اور حقدار شخصیت انہی کی سامنے آئی۔ اور وہ ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی، قومی خود مختاری کے تحفظ، دستور کی بالادستی اور عالمی سطح پر امریکی استعمار کی اسلام دشمنی کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرتے ہوئے اس شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ پوری قوم غم واندوہ میں ڈوب گئی۔ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی کارکن ان کی جدائی کی کسک اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر طبقہ ان کی دینی وقومی خدمات پر خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء)

(۲)

مولانا شاہ احمد نورانی بھی ہم سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ ہے جو سال رواں کی آخری سہ ماہی میں قومی سیاست کو برداشت کرنا پڑا۔ وہ دینی جماعتوں کے مشترکہ محاذ ”متحدہ مجلس عمل“ کے صدر اور جمعیۃ علماء پاکستان کے سربراہ تھے۔ ایک سینئر پالیمنٹیرین، بزرگ عالم دین، تجربہ کار سیاستدان اور بااصول رہنما کے طور پر ان کا احترام تمام دینی و سیاسی حلقوں میں یکساں طور پر پایا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے تمام طبقات اور سیاسی و دینی حلقوں میں ان کی اچانک وفات کا غم شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک ایسے وقت میں جدا ہوئے ہیں جب ان کی قیادت میں دینی جماعتوں کا اتحاد اپنے سیاسی کردار کے حوالے سے ایک انتہائی حساس اور نازک موڑ کی طرف بڑھ رہا تھا اور ان کی مدبرانہ قیادت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جا رہی تھی، مگر تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ وہ متحدہ مجلس عمل اور حکومت کے درمیان مذاکرات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے کہ بلاوا آ گیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے رب

کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آخرت کے طویل سفر پر روانہ ہوگئے۔

مولانا نورانی کا تعلق میرٹھ کے ایک دینی گھرانے سے تھا، ان کے والد محترم مولانا عبدالعلیم صدیقی کا شمار بریلوی مکتب فکر کے بڑے علماء اور مشائخ میں ہوتا تھا، ان کی پیری مریدی کا سلسلہ کئی ملکوں بلکہ بر اعظموں تک وسیع ہے اور عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ والد محترم کے بعد یہ وسیع حلقۂ ارادت مولانا نورانی کو ورثے میں ملا اور انہوں نے نہ صرف اسے برقرار رکھا بلکہ اپنی محنت اور سعیٔ پیہم کے ساتھ اس میں مسلسل اضافہ کرتے چلے گئے۔ مولانا مرحوم قیام پاکستان کے بعد میرٹھ سے پاکستان آگئے اور کراچی صدر کی کچھی میمن مسجد ان کا مرکز بنی۔ مسجد کے ساتھ کرائے کے فلیٹ میں ان کی رہائش تھی۔ مسجد میں وہ رمضان المبارک کے دوران تراویح اور نوافل میں قرآن کریم سنایا کرتے تھے۔ سال کا بیشتر حصہ مختلف ملکوں میں اپنے ارادت مندوں کے درمیان گزارنے کا معمول تھا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں جمعیۃ علماء پاکستان کے ٹکٹ پر کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پھر اپنی ذہانت، شرافت اور صلاحیت کے بل بوتے پر آگے ہی بڑھتے گئے۔ جمعیۃ علماء پاکستان کی صدارت سنبھالی، پاکستان قومی اتحاد کی قیادت میں صف اول میں جگہ پائی، قومی اسمبلی اور سینٹ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، ملی یک جہتی کونسل کی سربراہی کے منصب پر فائز ہوئے اور بالآخر تمام دینی مکاتب فکر کے مشترکہ محاذ ''متحدہ مجلس عمل'' کے قائد کی حیثیت سے قومی خود مختاری، جمہوری اقدار اور دستور کی بالادستی کی جدوجہد کرتے ہوئے دار فانی سے دار باقی کی طرف سدھار گئے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کی جماعت نے قومی اسمبلی میں سات نشستیں حاصل کیں، وہ اس کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر بنے اور دستور ساز اسمبلی میں دستور کی تیاری میں سرگرم کردار ادا کیا۔ وہ اپوزیشن کا متحرک حصہ تھے، مولانا مفتی محمودؒ، خان عبدالولی خان، پروفیسر غفور احمد، مولانا ظفر احمد انصاری اور چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کی رفاقت میں انہوں نے قوم کو متفقہ دستور دینے اور دستور میں بنیادی اسلامی دفعات کی شمولیت کے ساتھ ساتھ پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے دستوری تحفظ میں اہم رول ادا کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے عظیم سانحہ کے بعد بچے کھچے پاکستان کی قومی اسمبلی میں خان عبدالولی خان اور پھر مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں بننے والی اپوزیشن اگرچہ تعداد کے لحاظ سے مختصر تھی لیکن جن بھاری بھرکم شخصیات نے اس اپوزیشن کو اس قدر مضبوط بنا دیا تھا کہ ان کے بغیر دستور کو منظور کرانا حکومت کے بس

میں نہ رہا، ان میں مولانا شاہ احمد نورانیؒ بھی ایک قد آور شخصیت کے طور پر شامل تھے۔ وہ قومی اسمبلی اور پھر سینٹ کے متحرک ممبر رہے ہیں جو نہ صرف یہ کہ حق کی آواز اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے بلکہ قانون کی ترتیب اور تدوین میں ان کا کردار عملی اور موثر ہوتا تھا۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کی جدوجہد میں ان کا کردار انتہائی نمایاں تھا۔ نہ صرف قومی اسمبلی میں بلکہ ملک کے عوامی، سیاسی محاذ اور عالمی فورم پر بھی انہوں نے مسلمانوں کے عقیدہ ختم نبوتؐ کی وضاحت اور قادیانیوں کے مکروفریب کو بے نقاب کرنے میں بھی سرگرم کردار ادا کیا۔

مولانا نورانی کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں قومی سیاست کے فورم پر آنے کے بعد سے اپنی وفات تک وہ اپوزیشن ہی کے کردار پر قائم رہے، کسی حکومت کا حصہ بننا ان کے مزاج کو موافق نہ آیا، حتٰی کہ اس مسئلے میں اپنی جماعت میں تفریق اور مولانا عبدالستار نیازی جیسے مضبوط رفیق کی جدائی کو بھی برداشت کر لیا، اس معاملے میں انہیں نواب زادہ نصراللہ مرحوم کا ہم ذوق کہا جا سکتا ہے۔

مولانا نورانی ذاتی طور پر ہیروں کے بیوپاری تھے، ایک بار میں نے خود ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میں ہیرا شناس ہوں اور اس کا کاروبار کرتا ہوں جس سے میرے اخراجات چلتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس میں آپ کا کوئی شاگرد بھی بن سکتا ہے تو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ وہ بہت بڑے پیر تھے، قومی اسمبلی اور سینٹ کے رکن کی حیثیت سے بہت سی مراعات حاصل کر سکتے تھے اور ہیروں کے بیوپاری بھی تھے لیکن ان تمام مواقع کے باوجود انہوں نے سادہ زندگی بسر کی اور کرائے کے فلیٹ میں مقیم رہے۔ میں نے متعدّد بار اس فلیٹ میں ان سے ملاقات کی۔ یہ ایک سادہ سی رہائش گاہ تھی اور پرانی، وضع دار اور باوقار علماء کی طرز زندگی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مجھے پاکستان قومی اتحاد میں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، اس دوران عمومی اور خصوصی بیسیوں محافل میں ان کے ساتھ شرکت ہوئی، اپنے مسلک کے حوالے سے وہ بہت مضبوط اور متصلب تھے اور کبھی اس معاملے میں لچک نہیں دکھاتے تھے لیکن مشترکہ دینی اور سیاسی معاملات میں انہوں نے کبھی اس کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ تحریک نظام مصطفیٰؐ اور تحریک ختم نبوتؐ میں وہ قیادت کی صف میں ایک نمایاں شخصیت تھے، انہوں نے باہمی اشتراک وتعاون کے تقاضوں کی ہر جگہ پاسداری

کی اور اپنی جماعت کے رہنماؤں اور کارکنوں کو اس کے لیے ہمیشہ تیار کرتے رہے۔

بذلہ سنجی اور خوش کلامی ان کا طرۂ امتیاز تھی، ہلکے پھلکے جملوں کے ساتھ محفل کا رنگ بدل دینے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ شرافت اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے خوبصورت چوٹ کرتے تھے اور جس پر فقرہ کستے تھے وہ بھی اگر باذوق ہوتا تو چیں بجبیں ہونے کی بجائے حظ اٹھاتا تھا۔ ایک دور میں ان کا زیادہ تر وقت ملک سے باہر گزرنے لگا حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ لطیفہ عام ہو گیا کہ جب وہ پاکستان کے کسی حصے میں ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ مولانا نورانی پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل میری بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی کہ سال کے کئی مہینے ملک سے باہر گزرنے لگے۔ اس پس منظر میں کافی مدت کے بعد میری ان سے ملاقات اس موقع پر ہوئی جب وہ مولانا سمیع الحق کی دعوت پر ''دفاع افغانستان و پاکستان کونسل'' کی تشکیل کے سلسلے میں اکوڑہ خٹک تشریف لے گئے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو وہ مولانا سمیع الحق کی رہائش گاہ میں علماء کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو اٹھ کھڑے ہوئے، بڑے تپاک سے معانقہ کیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے پوچھنے لگے ''مولانا آپ پاکستان کے دورے پر کب آئے ہیں؟'' میں نے جواب میں کہا کہ یہی بات میں آپ سے پوچھنے والا تھا اس پر ایک ہلکا سے قہقہہ لگایا اور حال احوال پوچھنے لگے۔

میں نے ان کو پاکستان کی محافل میں بھی دیکھا اور لندن کی محافل میں بھی ان کے ساتھ شرکت کی اور ہر جگہ ان کی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا لطف اٹھایا ہے۔ وہ گفتگو اور ملاقات میں جس قدر نرم خو تھے، اپنے اصولوں کے معاملے میں اسی طرح بے لچک اور سخت تھے۔ ایک دور میں کراچی اور حیدرآباد کی سیاست میں ان کی جمعیۃ علماء پاکستان اور جماعت اسلامی پاکستان کا غلبہ تھا اور جے یو پی ان دو شہروں سے اچھی خاصی پارلیمانی نشستیں حاصل کیا کرتی تھی۔ پھر ارباب حل و عقد نے ان جماعتوں کا زور توڑنے کے لیے کراچی کو لسانی تفریق کی نذر کر دیا اور مہاجر غیر مہاجر کے نام سے وہ اودھم مچا کہ کراچی کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا۔ مولانا نورانی مہاجر تھے، اگر وہ اس تقسیم کے لیے تھوڑی سی ذہنی لچک دکھا دیتے تو بہت کچھ بچا سکتے تھے بلکہ بہت کچھ حاصل بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اصولوں کی خاطر اپنی جماعت کی پارلیمانی قوت قربان کر دی اور مہاجر غیر مہاجر کی تفریق کے خلاف مسلسل کلمۂ حق بلند کرتے رہے۔

انہوں نے جس بلند آہنگی کے ساتھ عالم اسلام کے بارے میں امریکی عزائم اور جارحیت کے

خلاف کلمۂ حق بلند کیا، طالبان کی اسلامی حکومت کو سپورٹ کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان اور عراق میں امریکہ کی مسلح مداخلت اور قبضے کے خلاف رائے عامہ کی رہنمائی کی، اور بڑھاپے اور علالت کے باوجود مسلسل اور متحرک کردار ادا کیا، وہ علماء کی نئی نسل کے لیے مشعل راہ اور دینی وسیاسی رہنماؤں کے لیے لائق رشک اور قابل تقلید ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، حسنات کو قبولیت سے نوازیں، سیئات سے درگزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور جملہ پسماندگان اور متوسلین کو صبر وحوصلہ کے ساتھ یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین!

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء)

یاسر عرفات مرحوم

(۱)

یاسر عرفات بھی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انہیں رملہ میں ان کے ہیڈکوارٹر میں امانتاً سپرد خاک کیا گیا ہے اور فلسطینی قیادت کی طرف سے کہا گیا ہے کہ آزاد فلسطینی ریاست کے قیام اور بیت المقدس کی اس ریاست میں شمولیت کے بعد انہیں بیت المقدس میں دفن کیا جائے گا۔ یاسر عرفات کے جنازے پر فلسطینی عوام اور ان کے عقیدت مندوں کے بے پناہ ہجوم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ زندگی کے آخری حصے میں متنازعہ ہوجانے کے باوجود فلسطینی عوام کے محبوب ترین رہنما تھے اور انہیں اپنے وطن کے عوام کی ایک بڑی اکثریت کی محبت اور عقیدت حاصل تھی۔

یاسر عرفات کا نام میں نے پہلی بار ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد اس وقت سنا جب وہ فلسطین اور بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے بعد فلسطین کی مزاحمتی تحریک کے قائد کے طور پر منظر پر نمودار ہوئے۔ اس سے قبل بھی وہ ایک فلسطینی مزاحمتی گروپ کی قیادت کر رہے تھے لیکن ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر، شام اور اردن کی خوفناک شکست اور صحرائے سینا اور گولان پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد جب فلسطین کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والے مختلف گروپوں نے یکجا ہو کر مشترکہ طور پر تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا

اعلان کیا اور یاسر عرفات کو اس کا متفقہ لیڈر منتخب کیا گیا تو عرفات کا نام فلسطین اور فلسطینیوں کی تحریک آزادی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

وہ میرا طالب علمی کا دور تھا اور میں جمعیۃ علماء اسلام کی سرگرمیوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں مصر کے صدر جمال عبد الناصر مرحوم ہماری سیاسی عقیدت کا مرکز و محور تھے اور ہم یہ سمجھتے تھے کہ عالم اسلام میں وہی مضبوط اور قد آور شخصیت ہیں جو عالم اسلام اور عرب دنیا کے خلاف مغربی استعماری جارحیت اور سازشوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے عرب دنیا اور فلسطین کے حوالے سے ہماری ذہنی و فکری ترجیحات صدر جمال عبد الناصر مرحوم کی پالیسیوں کے حوالے سے تشکیل پاتی تھیں۔ جمال عبد الناصر عرب قوم پرستی کے علمبردار تھے، وہ امریکی اور مغربی استعمار کے شدید ترین مخالف تھے اس لیے بائیں بازو اور روسی بلاک کی طرف ان کا میلان ہمارے نزدیک زیادہ قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ ہم یہ کہہ کر ان کا دفاع کیا کرتے تھے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے، حالات کا جبر ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یاسر عرفات کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ وہ بائیں بازو کی طرف رجحان رکھنے والے قوم پرست فلسطینی رہنما سمجھے جاتے تھے اور ایک لبرل مسلمان کے طور پر پہنچانے جاتے تھے۔ اس لیے انہیں مسلسل جمعیۃ علماء اسلام کے کارکنوں کی دلی ہمدردیاں حاصل رہیں۔

دائیں بازو اور بائیں بازو کی عالمی کشمکش میں پاکستان واضح طور پر امریکہ کا حلیف تھا اور اس کے ساتھ سیٹو اور سینٹو کے معاہدات میں شریک تھا۔ اس لیے پاکستان کے ساتھ فاصلے کو قائم رکھنا یاسر عرفات کی مجبوری تھی۔ پھر جب اردن میں فلسطینی حریت پسندوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کنٹرول کرنے کے لیے ان کے خلاف مسلح ریاستی کارروائی ضروری سمجھی گئی اور اس میں پاکستان کے فوجی دستوں نے اہم کردار ادا کیا تو یہ فاصلے مزید بڑھ گئے اور بہت سے پاکستانی حلقوں کو یہ شکایت ہونے لگی کہ پاکستان تو فلسطینی عوام کی حریت و آزادی کی غیر مشروط حمایت کر رہا ہے اور اسرائیل دشمنی میں پیش پیش ہے مگر فلسطینی قیادت اور یاسر عرفات کی جانب سے پاکستان کو مسئلہ کشمیر سمیت اہم معاملات میں وہ حمایت میسر نہیں ہے جس کی پاکستانی عوام کو ان سے توقع رہتی ہے۔

پھر افغانستان میں روس کی مسلح افواج کی آمد نے حالات کا سارا نقشہ تبدیل کر دیا۔ پاکستان کے وہ دینی حلقے جو امریکہ اور روس کی عالمی کشمکش میں کسی حد تک بائیں بازو کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے،

اپنے افغان بھائیوں کی حمایت میں روس کے مقابل جا کھڑے ہوئے جس کا فائدہ ظاہر ہے کہ عالمی سیاست میں امریکہ کو ہونا تھا۔ چنانچہ وہی ہوا اور افغان عوام کی روسی جارحیت کے خلاف مسلح جدوجہد کی پشت پناہی کر کے امریکہ نے اس مسلح مزاحمت اور اس کی پاکستانی حمایت دونوں کو اپنے پلڑے میں ڈال لیا۔ جس کے مثبت اور منفی نتائج اب تک سامنے آرہے ہیں اور خدا جانے کب تک ان کا ظہور ہوتا رہے گا۔

ادھر یاسر عرفات کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسرائیل کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عسکری قوت، امریکہ کی طرف سے اس کی مکمل اور غیر مشروط پشت پناہی اور افغانستان کی جنگ میں الجھ کر روسی بلاک کے بکھرنے کے عمل نے یاسر عرفات کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب فلسطین میں جو کچھ بھی ہوگا امریکہ کی مرضی سے ہوگا اور فلسطینی عوام کو اگر کچھ ملنا ہے تو اسی سے ملنا ہے۔ اس لیے انہوں نے معروضی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے کم سے کم پر قناعت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی حدود طے کرتے ہوئے امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ دوستی کا یہ ہاتھ یکطرفہ تھا جس کے ذریعے یاسر عرفات نے فلسطینی مسئلے کے حل کو مکمل طور پر امریکہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ان کی ''اجتہادی'' غلطی تھی لہٰذا نظری اور اصولی طور پر ہم نے برملا اس سے اختلاف کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا اور کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا جسے وہ کھٹکھٹاتے۔ اس لیے کہ سوویت یونین بکھر چکا تھا اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی کوئی حیثیت نہیں تھی چنانچہ ان کے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ اسرائیل اور امریکہ کے مشترکہ غیظ وغضب کا نشانہ بن کر منظر سے بالکل ہی غائب ہو جائیں یا خود کو امریکی ایجنڈے کے ساتھ نتھی کر کے جو کچھ بھی حاصل ہو سکتا ہے کر لیں، اور جو کچھ بھی بچایا جا سکتا ہو بچا لیں۔ یاسر عرفات نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور پھر اپنی تمام تر تگ و دو کو اسی نکتے پر مرکوز کر لیا۔

یاسر عرفات کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں بھی اس سے اختلاف ہے۔ لیکن یہ بات بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے مسلح جدوجہد ترک کرنے کے بعد ''مذاکرات کے ذریعے امن'' کے امریکی ایجنڈے کو قبول کر کے فلسطینی عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی جو جدوجہد کی اس میں انہیں مسلح جدوجہد سے زیادہ قربانیاں دینا پڑیں اور اس سے کہیں زیادہ صبر

و استقامت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر پورے فلسطین کی آزادی کی بجائے صرف بائیس فیصد علاقے پر آزاد فلسطینی ریاست کے فارمولے کو قبول کیا۔ انہوں نے امریکہ کو خوش رکھنے کے لیے ایک ایسی ''فلسطینی اتھارٹی'' کی صدارت کا تحقیر آمیز تمغہ اپنے سینے پر سجالیا جس کا زمین پر کوئی وجود نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری دو سال اپنے ہیڈ کوارٹر میں محصوری کے عالم میں بسر کیے۔ یہ سب کچھ کس لیے تھا، صرف اس لیے کہ امریکہ نے فلسطینی عوام سے ان کے وطن عزیز کے ایک چوتھائی سے بھی کم رقبے پر ''آزاد فلسطینی ریاست'' کے قیام کا جو وعدہ کر رکھا ہے وہ اس پر قائم رہے اور اسے اس سے منحرف ہونے کا کوئی جواز فراہم نہ ہو۔

مگر یاسر عرفات کی ان قربانیوں کا صلہ امریکہ نے کیا دیا؟ یہی کہ آخر میں یاسر عرفات کو فلسطینیوں کا جائز نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے ساتھ فلسطین کے مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ یاسر عرفات جسے فلسطینی عوام کی اکثریت نے اپنا لیڈر چنا تھا اور جس کی موت پر فلسطینی عوام نے دیوانہ وار جمع ہو کر دنیا کو ایک بار پھر بتا دیا کہ ان کی نمائندگی کا حق صرف اسے ہی حاصل تھا، مگر امریکہ اس کے ساتھ مذاکرات سے انکاری تھا اور اسے اس بات پر اصرار تھا کہ وہ یاسر عرفات سے گفتگو نہیں کرے گا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس نے امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابن کے ساتھ فلسطینیوں کے لیے جس کم از کم حد کا تعین کر لیا تھا اور جس پر امریکہ نے خود صاد کر لیا تھا، وہ اس کم از کم سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اسرائیل کو مزید کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔

یاسر عرفات ایک متحرک اور صبر آزما زندگی گزار کر اپنے مالک و خالق کے حضور پیش ہو چکے، ان کی جدوجہد اور تگ و تاز تاریخ کا حصہ بن چکی، اور اب تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری ان کے جانشینوں پر آپڑی ہے۔ اس مرحلہ پر وہ ہماری دعاؤں کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے جانشینوں کو فلسطینی عوام کے بہتر مستقبل کے لیے صحیح سمت میں پیش رفت کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔ البتہ اس کے ساتھ ہم یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والوں کو یاسر عرفات کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لیے کہ خود کو مکمل طور پر جبر کے سپرد کر دینا اور طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا زندگی سے دستبرداری کی علامت ہوا کرتا ہے۔ زندگی ہر حال میں

ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کا نام ہے اور اکثر ہاتھ پاؤں مارتے رہنے والوں کو زندگی مل بھی جایا کرتی ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۸ نومبر ۲۰۰۴ء)

(۲)

یاسر عرفات کی وفات سے فلسطین کی تحریک آزادی کا ایک دور ختم ہو گیا ہے اور اب یہ ان کے سیاسی جانشینوں پر منحصر ہے کہ وہ آزادئ فلسطین کی جدوجہد کو کس انداز سے آگے بڑھاتے ہیں۔ یاسر عرفات نے اس دور میں تحریک آزادئ فلسطین کا پرچم اٹھایا جب خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانیہ نے تسلط جما لیا تھا۔ اور برطانوی حکومت یہودیوں کے ساتھ کیے گئے اس وعدہ کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل تھی کہ وہ انہیں فلسطین میں آباد ہونے اور اپنا الگ قومی وطن قائم کرنے میں مدد دے گی۔ چنانچہ برطانیہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور برطانوی تسلط کے دور میں نہ صرف دنیا بھر سے آنے والے لاکھوں یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا موقع فراہم کیا بلکہ ان کے الگ وطن کی تشکیل کی راہ ہموار کی۔ حتیٰ کہ برطانیہ نے فلسطین پر اپنا قبضہ اس وقت ختم کیا جب وہاں یہودیوں کا الگ وطن عملاً قائم ہو چکا تھا اور اقوام متحدہ کے فورم پر اسے دنیا سے تسلیم کرایا جا چکا تھا۔ اس وقت فلسطین کے مفتی اعظم الحاج امین الحسینی مرحوم تھے جو فلسطین کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ اور فلسطینیوں کے حقوق کو یہودیوں کی دست برد سے بچانے کے لیے مصروف عمل تھے۔ یاسر عرفات کا تعلق اسی حسینی خاندان سے تھا اور اسی دور میں وہ فلسطین کی آزادی کی جدوجہد میں ایک نوجوان کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

فلسطینیوں کے ساتھ پہلا ظلم تو یہ ہوا کہ ان کی سرزمین پر باہر سے یہودیوں کو لا کر بسایا گیا اور انہیں اپنے ہی گھر میں بے گھر کر دیا گیا۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ جب اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے یہودیوں کے قومی وطن کے لیے اس کا ایک حصہ مخصوص کر دیا تو ان کی یہودیوں کی حکومت تو عالمی سرپرستی میں قائم کروا دی گئی لیکن جو حصہ فلسطینیوں کے قومی وطن کے لیے مخصوص کیا گیا اس میں فلسطینیوں کی حکومت بنوانے میں کوئی دل چسپی نہ لی گئی۔ بلکہ سرے سے اس کے امکانات ختم کرنے کے لیے فلسطین کے اس خطہ کو اردن، شام اور مصر میں تقسیم کر دیا گیا اور فلسطین کے اپنے باشندوں کی حیثیت امریکہ کے ان ”ریڈ انڈینز“ کی طرح ہو گئی جو اس براعظم میں یورپی آبادکاروں کی آمد اور ان کے تسلط کے بعد اپنے ہی وطن میں بے گھر اور اجنبی ہو گئے تھے اور ان کا قومی تشخص آہستہ آہستہ تاریخ کے

دھندلکوں میں گم ہوکر رہ گیا تھا۔

فلسطین کو تقسیم کرکے اس کے ایک حصے میں یہودیوں کا قومی وطن بنوانے والوں کی بدنیتی اسی سے ظاہر ہوگئی تھی کہ وہ یہودیوں کا وطن بنوانے میں سنجیدہ ہیں لیکن فلسطینیوں کا الگ وطن قائم کروانے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ ورنہ اگر اسی وقت یہودیوں کی طرح فلسطینیوں کی بھی کوئی الگ حکومت عالمی سرپرستی میں قائم کرادی جاتی اور اقوام متحدہ اسے اسرائیل کی طرح تحفظ فراہم کرتی تو اصولی طور پر غلط یا صحیح ہونے کی بحث سے قطع نظر یہ مسئلہ عملی طور پر اسی وقت حل ہوچکا ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہوجاتا تو مڈل ایسٹ کے حوالہ سے امریکہ اور مغرب کے اس ایجنڈے کا کوئی جواز باقی نہ رہ جاتا جس پر گزشتہ نصف صدی سے مسلسل عمل ہو رہا ہے اور جس کی تباہ کاریاں پوری دنیا کے امن کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں۔

اس پس منظر میں یاسر عرفات اور اس طرح کے دیگر فلسطینی لیڈروں کی جدوجہد کا سب سے بڑا ہدف فلسطینیوں کے جداگانہ تشخص اور حقوق کو دنیا سے تسلیم کرانا اور فلسطین کو اسرائیل اور دیگر عرب ممالک کی بندر بانٹ میں تحلیل ہونے سے بچانا تھا۔ اور اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اگر اس وقت چند سرفروش اور جانباز فلسطینی اپنی جانوں پر کھیل کر فلسطین کی مسلح تحریک آزادی کا آغاز نہ کرتے تو جس فلسطین کے ایک حصے کو یہودیوں کے قومی وطن کے طور پر اسرائیل کا نام دے دیا گیا تھا اس کا باقی ماندہ حصہ رفتہ رفتہ اردگرد کے عرب ممالک کی جغرافیائی سرحدوں میں گم ہوجاتا اور ریڈ انڈینز کی طرح فلسطینی بھی تاریخ کا ایک گمشدہ باب بن کر رہ جاتے۔

اس وقت کی معروضی صورتحال یہ تھی کہ اسرائیل قائم ہونے کے بعد ترقی و استحکام اور قوت کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا، فلسطین کے باقی ماندہ حصے اردگرد کے عرب ممالک کے قبضے میں تھے، مسئلہ فلسطین کی فائل عرب حکومتوں کے درمیان فٹ بال بنی ہوئی تھی، جبکہ چند سرفروش اور جانباز فلسطینی مسلح کارروائیوں کے ذریعہ دنیا کو اپنے وجود اور تشخص کا احساس دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں ایک یاسر عرفات بھی تھے اور ظاہری طور پر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان سرفروشوں اور جانبازوں کی محنت اپنے جذبات کے اظہار تک ہی محدود رہے گی مگر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر، شام اور اردن کی شرمناک شکست اور بیت المقدس پر اسرائیل کے قبضہ نے حالات کا

پانسہ پلٹ دیا اور اب عرب حکومتوں کو احساس ہونے لگا کہ یہ جنگ فلسطین کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی اور فلسطینیوں کو نظر انداز کر کے اسرائیل کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہیں روکا جا سکتا۔ چنانچہ مسلح کارروائیاں کرنے والے گروپوں کو اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا گیا اور یاسر عرفات کی قیادت میں تحریک آزادئ فلسطین کو از سر نو منظم کر کے آزادئ فلسطین کی جدوجہد کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا گیا۔

یاسر عرفات بنیادی طور پر ایک قوم پرست فلسطینی لیڈر تھے، ان کا شمار لبرل قسم کے مسلمانوں میں ہوتا تھا اور اس وقت کی عالمی کشمکش میں ان کا رجحان بائیں بازو کی طرف نمایاں تھا۔ اس لیے تحریک آزادی فلسطین انہی خطوط پر آگے بڑھی اور یاسر عرفات اپنی قوم پرستی، جذبۂ حریت اور حوصلہ و جرأت کے حوالہ سے فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انہیں اس دوران نہ صرف مغربی استعمار اور اس کے لے پالک اسرائیل سے سابقہ درپیش تھا بلکہ خود اپنوں کی مزاحمت اور مخالفت کا بھی سامنا تھا۔ چنانچہ انہیں جس طرح اردن اور تیونس میں اپنے مراکز سے پیچھے ہٹنا پڑا اس کا تذکرہ تاریخ میں تحریک آزادئ فلسطین کے ایک افسوسناک باب کے طور پر ہی کیا جا سکے گا۔

یاسر عرفات نے نہ صرف اسرائیلی تسلط کے خلاف مسلح مزاحمت کی قیادت کی اور ان کی راہنمائی میں فلسطینی چھاپہ مار گروپوں نے اسرائیل کو مسلسل الجھائے رکھا بلکہ عالمی سیاست کے فورم پر بھی یاسر عرفات نے فلسطین کے کاز کی کامیابی کے ساتھ ترجمانی کی اور بین الاقوامی سیاست میں ان کا نام حوصلہ مند اور مدبر سیاسی رہنماؤں میں شمار ہونے لگا۔ یاسر عرفات کو ایک عرصہ تک فلسطینیوں کے متفقہ قومی لیڈر کی حیثیت حاصل رہی۔ لبرل اور قوم پرست حلقے تو ان کے ساتھ تھے، دینی حلقوں نے بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ قوم پرستی، لبرل ازم اور بائیں بازو کی طرف رجحان تحریک آزادی کے سیاسی تقاضوں میں سے ہیں اور اسرائیل اور امریکہ کے مقابلہ کے لیے انہیں کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عالمی حالات کے جبر نے جب ریاست عرفات کو امریکہ جانے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے فلسطین کے حوالہ سے امریکی ایجنڈے کو ایک حد تک قبول کر لیا تو دینی رجحانات رکھنے والے مسلح فلسطینی گروپوں کے لیے اس صورتحال کو جوں کا توں قبول کرنا ممکن نہ رہا، اس لیے انہوں نے ہتھیار ڈالنے اور مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ ان کی مسلح کارروائیاں مسلسل جاری ہیں۔

یاسر عرفات کی مجبوری یہ تھی کہ عالمی سطح پر امریکہ کے مقابلہ میں کوئی قوت ایسی موجود نہیں رہی تھی جس کا سہارا لیا جا سکے۔ سوویت یونین بکھر چکا تھا اور غیر جانبدار تحریک یا اسلامی سربراہ کانفرنس کی حیثیت گپ شپ کے ایک فورم سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس لیے اب اس حوالہ سے جو بھی کرنا ہے امریکہ نے ہی کرنا ہے اور فلسطینیوں کو جتنا کچھ بھی ملنا ہے اسی سے ملنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ معروضی حالات میں فلسطینیوں کے لیے جو کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اس کم از کم پر قناعت کر کے اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے اور امریکہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا جائے۔ مگر دینی مزاج اور اسلامی ذہن رکھنے والے مسلح گروپوں کا موقف یہ تھا کہ فلسطین کے حوالہ سے امریکی سرپرستی اور اس کے ایجنڈے کو قبول کرنے کا مطلب اپنے وجود اور تشخص سے دست برداری ہے اور فلسطین کی آزادی کے لیے اب تک قربانیاں دینے والوں کی جدوجہد کی نفی ہے، اس لیے اسے کسی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

یاسر عرفات نے یقیناً یہ سب کچھ پورے خلوص کے ساتھ کیا ہوگا، فلسطینیوں کے مفاد میں کیا ہوگا اور اس کے علاوہ کوئی متبادل راہ نہ پا کر کیا ہوگا۔ لیکن اس کے بعد امریکہ اور اسرائیل نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور اتنی بڑی قربانی کا جو صلہ دیا ہے وہ بھی تاریخ کا ایک عبرتناک باب ہے۔ انہوں نے فلسطینیوں کو ان کے وطن کے ایک چوتھائی سے بھی کم حصے پر فلسطینی ریاست کے قیام کا مبہم وعدہ کر کے لالی پاپ دے دیا۔ یاسر عرفات کے سینے پر ایک ایسی فلسطینی اتھارٹی کے صدر کا تحقیر آمیز تمغہ سجا دیا جس کا زمین پر کوئی وجود نہیں ہے۔ امریکہ نے یاسر عرفات کے ساتھ آخر میں گفتگو تک کرنے سے انکار کر دیا اور یاسر عرفات کو آخری دو سال اپنے ہیڈ کوارٹر میں محصوری کے عالم میں بسر کرنا پڑے۔

ہمیں یاسر عرفات کی اس رائے سے ضرور اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن ان کی جدوجہد اور قربانیوں سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں، ان کی غلطیوں سے درگزر کرتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، ان کے جانشینوں کو فلسطینی قوم کی صحیح سمت رہنمائی کی توفیق دیں اور عالم اسلام کے ان لیڈروں کو سبق حاصل کرنے کی توفیق دیں جو خود سپردگی کے عالم میں امریکہ کی چھتری تلے کھڑے بہتر مستقبل کا پرفریب منظر تلاش کر رہے ہیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۱۷ نومبر ۲۰۰۴ء)

خان عبدالولی خان مرحوم

خان عبدالولی خان ۹۰ برس کے لگ بھگ عمر پاکر پشاور میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی پاکستان کی قومی سیاست اور پختونوں کی قومیتی سیاست کا ایک باب مکمل ہوگیا۔ وہ پاکستان اور صوبہ سرحد کی سیاست میں نصف صدی سے زیادہ عرصے تک متحرک رہے اور مختلف تحریکوں میں انہوں نے سرگرم کردار ادا کیا۔ ان کے والد محترم خان عبدالغفار خان مرحوم کو جنوبی ایشیا کی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل تھا اور وہ اس خطے کی تحریک آزادی کے سرکردہ راہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ خان عبدالغفار خان کی سیاست کا آغاز شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی اس تحریک سے ہوا جسے دنیا "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے یاد کرتی ہے اور جس کے نتیجے میں شیخ الہندؒ کو مالٹا کے جزیرے میں ساڑھے تین برس سے زیادہ عرصے تک بڑھاپے کے ایام گزارنا پڑے۔

یہ برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی برطانوی استعمار سے آزادی کی جدوجہد تھی جو مسلح بغاوت کی صورت میں منظم کی جارہی تھی۔ اس میں جاپان اور جرمنی کے ساتھ روابط قائم کیے گئے تھے جو اس وقت (پہلی عالمی جنگ میں) برطانیہ کے حریف تھے اور ترکی کی خلافت عثمانیہ کو آمادہ کیا گیا تھا کہ اگر متحدہ ہندوستان کے اندر سے برطانوی تسلط کے خلاف مسلح بغاوت ہو تو وہ مجاہدین آزادی کی مدد کرے گی۔ عثمانی وزیر جنگ انور پاشا اور حجاز مقدس میں عثمانی خلافت کے نمائندے غالب پاشا کے ساتھ معاملات حتمی طور پر طے پا رہے تھے کہ خلافت عثمانیہ کے خلاف گورنر مکہ شریف حسین کی بغاوت اور اس کے ساتھ ہی ریشمی رومالوں کی صورت میں تحریر کیے گئے بغاوت کے منصوبے کے بعض حصوں کے انکشاف نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور ان کے رفقاء کو حجاز مقدس سے گرفتار کر کے مالٹا کے جزیرے میں محبوس کر دیا گیا۔ ادھر متحدہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں گرفتاریاں شروع ہوئیں اور تحریک کے خفیہ مراکز پولیس ایکشن کے زد میں آگئے۔ اس تحریک کے مراکز میں ایک "اتمان زئی" بھی تھا جو خان عبدالولی خان کی جائے پیدائش ہے۔ ان کے والد خان عبدالغفار خان اس مرکز کے ذمہ دار تھے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ قبائلی مجاہدین کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے روابط کا ایک اہم ذریعہ بھی تھے۔

یہ برطانوی استعمار کے خلاف مسلح تحریکات کا آخری باب تھا جس کی ناکامی کے بعد تحریک آزادی کا

رخ مکمل طور پر پر امن جدوجہد کی طرف مڑ گیا اور شیخ الہندؒ نے بھی مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس آنے پر اسی پر صاد کیا۔ اس پس منظر میں ''جمعیۃ علماء ہند'' کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے ۱۹۲۶ء میں کامل آزادی کے نعرے کے ساتھ برطانوی استعمار کے خلاف پر امن سیاسی جدوجہد کا اعلان کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں ''آل انڈیا نیشنل کانگریس'' نے آزادئ کامل کو اپنی سیاسی جدوجہد کی حقیقی منزل قرار دیا۔ خان عبدالغفار خان مرحوم کو شیخ الہندؒ کے ایک رفیق کار کی حیثیت سے جمعیۃ علماء ہند کے ایک بزرگ راہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ پھر جب وہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں آل انڈیا نیشنل کانگریس میں شریک ہوئے تو گاندھی جی کے ''فلسفہ عدم تشدد'' اور آزادی کے لیے پر امن سیاسی جدوجہد میں آگے بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ ''سرحدی گاندھی'' کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ صوبہ سرحد کے عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور انہیں آزادی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی میدان میں بھی خان عبدالغفار خان کی ''خدائی خدمت گار تحریک'' کا ایک بڑا کردار ہے۔ صوبہ سرحد کے عوام کے سیاسی و سماجی ارتقاء کی تاریخ میں ان کی خدمات کو ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔

اس قدرے تفصیلی پس منظر کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خان عبدالولی خان مرحوم نے اس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی تھی اور ان کی نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط جدوجہد پر اس ماحول اور پس منظر کی چھاپ ہر مرحلے میں نمایاں نظر آتی ہے۔ خان عبدالولی خان اپنے والد خان عبدالغفار خان مرحوم کی طرح کانگریسی تھے اور اس کے اظہار میں انہیں کبھی حجاب نہیں رہا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ راوی ہیں کہ ۱۹۷۰ء کے عام الیکشن کے بعد جب شیخ مجیب الرحمان، ذوالفقار علی بھٹو، اور جنرل یحییٰ خان کے درمیان سیاسی دھما چوکڑی کا آغاز ہوا تو قومی اسمبلی میں چھوٹی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے مل کر مفاہمت کے لیے کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے جب ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمان کے ساتھ مولانا مفتی محمود اور خان عبدالولی خان کے مذاکرات ہو رہے تھے تو انہوں نے شیخ مجیب الرحمان سے یہ تاریخی جملے کہے کہ

> ''شیخ صاحب! آپ مسلم لیگی ہیں اور ہم کانگریسی ہیں۔ کل آپ برصغیر کی تقسیم کی بات کر رہے تھے تو ہم نے اس سے اختلاف کیا تھا کہ ایسا نہ کرو کہ اس سے مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔ اور آج جب پاکستان کو تقسیم کرنے کی بات ہو رہی ہے تو ہم آپ سے یہ

کہنے آئے ہیں کہ پاکستان کو نہ ٹوٹنے دیں اس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا"۔

خان عبدالولی خان مرحوم کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے سیاسی اتحاد کے دور میں گوجرانوالہ آئے اور مرکزی جامع مسجد شیرنوالہ باغ میں عوام کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ وہ دوٹوک لہجے میں بات کرنے کے عادی تھی، مجھے ان کے اس انداز نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے اس جلسے میں بھٹو حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے دو لطیفے سنائے جو آج تک میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

انہوں نے کہا کہ بھٹو حکومت کو پنجاب اوپر لایا ہے اس لیے پنجاب ہی کو اسے اتارنے کے لیے بڑا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ اس پر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک دور دراز دیہات کا رہنے والا شہر میں آیا تو کوئی مؤذن مسجد کے مینارے پر چڑھ کر اذان دے رہا تھا۔ جس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتے تھے، مؤذن اسی طرح بلند مینار پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے تاکہ آواز زیادہ دور تک جا سکے۔ اس دیہاتی نے مؤذن کو بلند مینار پر اذان دیتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اس کو نیچے اترنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا اور مدد کے لیے چیخ و پکار کر رہا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور مینار کے چاروں طرف گھوم کر اس نے دیکھا کہ مدد کے لیے اس کے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ ہے؟ جب کسی طرف سے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو نیچے سے بلند آواز کے ساتھ مؤذن کو پکارا کہ "بھئی مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آرہا، اس لیے جس نے تجھے اوپر چڑھایا ہے وہی تجھے نیچے بھی اتارے گا"۔

دوسری بات ولی خان مرحوم نے یہ کہی کہ پاکستان ایک بار ٹوٹ چکا ہے اب باقی ماندہ پاکستان کو بچانے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہماری حرکتوں کی وجہ سے خدانخواستہ یہ بھی نہ ٹوٹ جائے۔ اس پر انہوں نے ایک اور لطیفہ سنایا کہ ایک شخص چوڑیوں کی ٹوکری زمین پر رکھے کھڑا تھا کہ پولیس کا ایک سپاہی آیا، اس نے ٹوکری کو ٹھوکر مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ ٹوکری والے نے جواب دیا کہ جناب ایک ٹھوکر اور مار دیں تو اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔

خان عبدالولی خان مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی رفاقت پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اسی رفاقت کے باعث مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے اور پاکستان میں علماء کرام کے لیے اقتدار کی سیاست کا دروازہ وا ہوا۔ اسی رفاقت کی وجہ سے ۱۹۷۳ء کا دستور اس صورت میں

منظور ہوا کہ اس میں اسلامی نظام، جمہوریت، اور صوبوں کے حقوق کے معاملات ایسے توازن کے ساتھ ایڈجسٹ ہوگئے کہ بہت سے نازک مراحل سے گزرنے کے باوجود یہ دستور آج بھی پاکستان کے تمام صوبوں کا متفقہ دستور ہے اور اسے پاکستان کی بقاء و استحکام، اسلام و جمہوریت کی پاسداری، اور صوبوں کے حقوق کے تحفظ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کوئی سمجھدار مؤرخ اس دور میں ملکی سیاست اور پاکستان کے مستقبل پر جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی سیاسی رفاقت کے اثرات کا جائزہ لینا چاہے تو یہ بڑی دلچسپی کا حامل موضوع ثابت ہوگا اور قومی سیاست کے بہت سے عقدے حل ہوتے نظر آئیں گے۔ خان عبدالولی خان مرحوم نے بہت سے معاملات میں مولانا مفتی محمودؒ پر اعتماد کیا بلکہ انہیں کھلے بندوں اپنا امام تک کہہ دیا۔ اسی طرح مولانا مفتی محمودؒ نے بھی مختلف مواقع پر خان عبدالولی خان مرحوم کو بھرپور اعتماد سے نوازا۔

۱۹۷۲ء میں صوبہ سرحد میں حکومت کی تشکیل کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کو دو بڑے باہمی سیاسی حریفوں خان عبدالولی خان مرحوم اور خان عبدالقیوم خان مرحوم کی طرف سے یکساں طور پر پیشکش کی گئی تھی۔ دونوں جمعیۃ علماء اسلام کی قیادت میں صوبائی حکومت بنانے کے لیے تیار تھے اور دونوں نے جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے پیش کردہ تمام شرائط کو منظور کر لیا تھا۔ اب یہ فیصلہ جمعیۃ علماء اسلام کے کورٹ میں تھا کہ وہ ان میں سے کس کو ترجیح دیتی ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں جمعیۃ کے دو بڑے بزرگوں میں اس پر اختلاف ہوگیا۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی رائے خان عبد القیوم خان مرحوم کے ساتھ کولیشن بنانے کی تھی جبکہ مولانا مفتی محمودؒ چاہتے تھے کہ خان عبدالولی خان مرحوم کے ساتھ کولیشن بنائی جائے۔ دونوں میں اس حوالے سے زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر بالآخر مولانا مفتی محمودؒ جمعیۃ کی مجلس شوریٰ سے اپنی رائے منوانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ خان عبدالولی خان اور ان کے ساتھی بھروسے کے لوگ ہیں، وہ جو بات طے کریں گے اس پر قائم بھی رہیں گے۔ جبکہ خان عبدالقیوم خان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کون سا رخ اختیار کریں۔ یہ خان عبدالولی خان اور نیشنل عوامی پارٹی کی اصول پسندی اور وضعداری پر مولانا مفتی محمودؒ اور جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے اعتماد کا اظہار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جمعیۃ کو اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی کہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا راستہ بتدریج الگ ہوتا چلا گیا۔

خان عبد الولی خان مرحوم معروف معنوں میں ایک ”قوم پرست پختون لیڈر“ تھے اور اس حوالے سے انہیں ایک علاقائی سیاستدان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن قومی سیاست میں انہوں نے پاکستان کو متحد رکھنے، ملک کے تمام لوگوں کے حقوق کے تحفظ، جمہوری اقدار کی بالادستی، اور ملکی وحدت و سالمیت کے استحکام کے لیے جو مسلسل کردار ادا کیا اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں گزشتہ کسی کالم میں اپنے اس تاثر اور احساس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ ۱۹۷۲ء کی قومی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ، اور خان عبد الولی خان مرحوم کے درمیان جو سہ فریقی اتحاد ہوا تھا، وہ اگر نہ ٹوٹتا تو ان حالات میں پاکستان کو اس سے بہتر سیاسی قیادت میسر نہیں آسکتی تھی۔ یہ ٹیم اگر مل کر ملک کی قیادت کرتی تو آج نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا اور عالم اسلام کی صورتحال بہت مختلف ہوتی۔ مگر ملک وقوم کی بدقسمتی سے یہ ”سہ فریقی معاہدہ“ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور نادیدہ قوتوں نے ۱۹۷۲ء کے باقی ماندہ پاکستان کو اس کی صحیح قیادت سے محروم کر دیا۔

مجھے خان عبد الولی خان مرحوم کے ساتھ زیادہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملا لیکن میں ان کے مداحوں میں سے ہوں۔ بہت سے معاملات میں ان سے اختلاف بھی رہا اور رائے و موقف کی حد تک آج بھی وہ اختلاف قائم ہے، لیکن ان کی وضعداری اور اپنی بات پر قائم رہنے کی روایت میرے نزدیک ہمیشہ قابل تعریف رہی ہے۔ وہ ملک کے بزرگ سیاستدانوں میں سے تھے، انہوں نے اپنے بعض تحفظات کے باوجود ہمیشہ ملکی استحکام اور سالمیت کی بات کی اور ایک لبرل بلکہ سیکولر سیاستدان ہونے کے باوجود دستور میں اسلامی دفعات، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ، اور دیگر بہت سے دینی معاملات میں دینی جماعتوں کا ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور ان کے جانشین اسفندیار ولی خان کو اپنے باپ دادا کی روایات کو قائم رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۳۰ جنوری ۲۰۰۶ء)

عامر چیمہ شہید

(۱)

عامر چیمہ شہید کو اس کے آبائی گاؤں سارو کی چیمہ تحصیل وزیر آباد میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے۔

جنازے کے وقت کو آخر تک ابہام میں رکھا گیا اور پوری کوشش کی گئی کہ عوام کو نماز جنازہ کے پروگرام کی کوئی کنفرم اطلاع نہ مل سکے، اس کے باوجود عوام کے جم غفیر نے شہید کے جنازے میں شرکت کی۔ میری خواہش بھی جنازے میں شرکت کی تھی مگر اطلاعات متضاد تھیں، بعض اخبارات اور ایک ٹی وی چینل نے شام ۴ بجے کی خبر دی تھی مگر فون پر ساروکی سے اطلاع ملی کہ نماز جنازہ دس بجے کے لگ بھگ ادا کی جائے گی۔ مجھے اس روز ظہر کی نماز میر پور آزاد کشمیر کے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں ادا کرنا تھی جہاں ہمارے ایک عزیز شاگرد حافظ نوید ساجد (فاضل نصرۃ العلوم) کا نماز ظہر کے فوراً بعد نکاح تھا، اس کے بعد مدرسۃ البنات میں خواتین کے اجتماع سے خطاب تھا۔ میں برادرم مولانا حافظ محمد ریاض سواتی کے ہمراہ گوجرانوالہ سے روانہ ہوا تو خیال تھا کہ نماز جنازہ میں شرکت کر کے میر پور وقت پر پہنچ جائیں گے لیکن جب پورے گیارہ بجے وزیر آباد کے بائی پاس روڈ پر ساروکی چیمہ موڑ کے پاس پہنچے اور فون پر ساروکی رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ میت ابھی تک نہیں پہنچی اور کوئی حتمی اطلاع نہیں ہے کہ کس وقت پہنچے گی، اس لیے ہم بادل نخواستہ آگے روانہ ہو گئے۔

عامر چیمہ شہید نے ایک گستاخ رسول ایڈیٹر پر حملہ کر کے جرمن پولیس کی حراست میں جس طرح جام شہادت نوش کیا ہے اور اس کی شہادت پر پاکستان اور جرمنی کی حکومتوں نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اس سے کئی سوال لوگوں کے ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور ان کا کھلے بندوں اظہار بھی ہو رہا ہے۔ جہاں تک ایک جرمن ایڈیٹر پر عامر چیمہ کے قاتلانہ حملے کے بعد اس کی گرفتاری کا تعلق تھا یہاں تک کوئی الجھن کی بات نہیں تھی، اس لیے کہ یہ جرمنی کی پولیس اور حکومت کا حق تھا کہ ان کے ایک شہری پر حملہ کرنے والے شخص کو وہ گرفتار کریں اور اس پر اپنے قانون کے مطابق مقدمہ چلائیں۔ آگے عامر چیمہ اور اس کے پشت پناہوں کا کام تھا کہ وہ عدالت میں اس الزام کا کس طرح سامنا کرتے ہیں اور کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جرمن پولیس کی حراست میں عامر چیمہ کی پر اسرار موت نے صورتحال کو خاصا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اگرچہ پاکستان اور جرمنی کی حکومتیں اس پیچیدگی اور سنگینی کو چھپانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں لیکن یہ کوشش زیادہ دیر تک کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی، اس لیے کہ عالمی سطح پر یہ سوال اٹھ رہا ہے اور بین الاقوامی حلقوں میں جرمن پولیس کا یہ موقف مسلسل ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ جرمن پولیس کی حراست کے دوران عامر چیمہ نے بقول جرمن پولیس آخر خودکشی کیسے کر لی؟

خودکشی کا یہ موقف بجائے خود محل نظر ہے اس لیے کہ اگر اس نوجوان کو خودکشی کرنا ہوتی تو پھر وہ جرمن ایڈیٹر پر حملے کا قدم ہی نہ اٹھاتا۔

اس معاملے میں مسلمانوں کے جذبات اور نفسیات دوسری اقوام سے قطعی طور پر مختلف ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی مسلمان نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کے حوالے سے کوئی قدم اٹھایا ہے تو پھر اس کا طرز عمل معذرت خواہی اور مایوسی کا نہیں بلکہ والہانہ شیفتگی اور جاں سپاری کا رہا ہے، اس لیے ایسے کسی شخص سے خودکشی جیسے مایوس کن فعل کی کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عامر چیمہ شہید کے والد محترم اور پاکستان کی دینی قیادت سمیت کوئی بھی سنجیدہ شخص خودکشی کے اس موقف کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور ملک بھر بلکہ دنیائے اسلام میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ عامر چیمہ شہید جرمن پولیس کی حراست کے دوران تشدد سے جاں بحق ہوا ہے اور اس پر پردہ ڈالنے کے لیے جرمن پولیس نے خودکشی کا شوشہ چھوڑ دیا ہے۔

اس پر مجھے دورِ نبویؐ کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے جو امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں مختلف مقامات پر روایت کیا ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کا ہیرو بھی عامر نامی ایک نوجوان صحابی تھا جس نے خود اپنی ہی تلوار کے وار سے شہادت پائی اور اس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے مگر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تردید فرما کر اس کے شہید ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہ نوجوان عامر بن الاکوعؓ تھے جو اپنے بڑے بھائی حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کے ہمراہ غزوۂ خیبر میں شریک تھے۔ بڑے بہادر نوجوان تھے اور اچھے رجز گو شاعر اور حدی خواں تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق لشکر خیبر کی طرف بڑھ رہا تھا، خود آنحضرتؐ لشکر کی کمان کر رہے تھے کہ دوران سفر کسی صحابیؓ نے عامرؓ سے فرمائش کی کہ وہ انہیں جنگی ترانہ سنائے، جسے اس دور میں رجز کہا جاتا تھا یا حدی خوانی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ عامرؓ نے اس کی فرمائش پر حدی خوانی شروع کر دی جو رجزیہ اشعار پر مشتمل تھی۔ حضورؐ تک آواز پہنچی تو دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ ساتھیوں نے بتایا کہ یہ عامرؓ ہے جو لوگوں کی فرمائش پر حدی گا رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے۔ روایت میں ہے کہ جناب رسول اکرمؐ اگر اپنے کسی ساتھی کے بارے میں یہ جملہ فرماتے تھے تو اس کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا تھا کہ یہ شخص اب شہادت سے ہمکنار ہوگا اور سیدھا جنت میں جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جناب نبی

اکرمؐ سے عامرؓ کے بارے میں یہ جملہ سن کر حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ یارسول اللہ! اس کے لیے تو شہادت اور جنت واجب ہوگئی، اگر یہ کچھ دیر اور زندہ رہ جاتا تو ہم اس سے مزید فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

خیبر کے معرکے میں جب لشکر آمنے سامنے ہوئے تو عامرؓ کا سامنا ایک یہودی سے ہوا۔ عامرؓ نے اس پر تلوار کا وار کیا۔ تلوار چھوٹی تھی، وہ یہودی پیچھے ہٹا تو وہی تلوار واپس پلٹ کر عامرؓ کے گھٹنے پر آلگی، زخم کاری ثابت ہوا اور اسی زخم سے عامرؓ کی شہادت واقع ہوگئی۔ عامرؓ کے بڑے بھائی حضرت سلمہ بن الاکوعؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اس پر یہ کہتے تھے کہ عامرؓ نے خودکشی کی ہے اس لیے اس کی ساری نیکیاں برباد ہوگئیں ہیں۔ سلمہؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر سے واپسی پر مجھے آنحضرتؐ نے پریشان حالت میں دیکھا تو اس کی وجہ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا کہ لوگوں کی ان باتوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا کہنے والے غلط کہتے ہیں، عامرؓ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں دوہرا اجر ملے گا اور اس جیسا مجاہد نوجوان عرب دنیا میں اور کون پیدا ہوا ہوگا۔ سلمہؓ کو حضورؐ کی زبان مبارک سے اپنے بھائی کے بارے میں یہ جملے سن کر تسلی ہوئی اور ان کی پریشانی دور ہوئی۔

عامر چیمہ کی شہادت کن حالات میں ہوئی ہے اس کے بارے میں تو غیر جانبدارانہ تحقیقات کے ذریعے ہی کچھ معلوم ہوسکتا ہے جو جرمن حکومت اور پاکستان حکومت دونوں کی ذمہ داری ہے۔ جرمن حکومت کی اس لیے کہ اس کی پولیس کی حراست کے دوران ایک غیر ملکی جاں بحق ہوا ہے اور پاکستانی حکومت کی اس لیے کہ اس کا ایک شہری دوسرے ملک میں وہاں کی پولیس کی حراست میں شہید ہوگیا ہے۔ ناموس رسالت کے مسئلہ سے قطع نظر عام حالات میں بھی یہ کیس اس طرح نظر انداز کرنے یا اس طرح دبانے کا نہیں ہے جس کی دونوں حکومتیں کوشش کرتی دکھائی دے رہی ہیں۔ جبکہ تحفظ ناموس رسالت کے حوالے سے اس کی اہمیت کئی گنا مزید بڑھ جاتی ہے کہ اس نوجوان کے ساتھ صرف پاکستان کے عوام نہیں بلکہ دنیا بھر کے غیور مسلمانوں کے جذبات بھی وابستہ ہوگئے ہیں۔

جرمن پولیس کی حراست کے دوران عامر چیمہ کی موت کی عملی صورت کیا ہوئی ہوگی، یہ تو تحقیقات کے ذریعے ہی معلوم ہوگا۔ البتہ ایک پرانا واقعہ میرے ذہن کی سکرین پر بار بار جھلملا رہا ہے، اسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا مناسب خیال کر رہا ہوں۔ ۱۹۷۷ء کی پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کے دوران کا واقعہ ہے کہ تحریک کو دبانے کے لیے لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا، اس دوران قومی اتحاد کے

دفتر میں غیر قانونی اجلاس منعقد کرنے کے الزام میں اس وقت کی پوری مرکزی کونسل کو گرفتار کر لیا گیا جن میں راقم الحروف شامل تھا۔ جبکہ میاں محمود علی قصوری، اقبال احمد خان، ملک محمد اکبر ساقی اور حضرت مولانا محمد اجمل خان بھی ان گرفتار شدگان میں تھے۔ ہم پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا، یہ عدالت لیفٹیننٹ کرنل نصیر احمد کی سربراہی میں کیمپ جیل میں کم وبیش روزانہ بیٹھتی تھی۔ اس کی کاروائی کے حوالے سے ان کے تھانے کا روزنامچہ زیر بحث تھا، پولیس افسر نے اپنی بات کو پکا کرنے کے لیے یہ جملہ کہہ دیا کہ ہمارے نزدیک تو یہ روزنامچہ قرآن کریم ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زبان سے یہ جملہ نکلتے ہی حضرت مولانا محمد اجمل خان بپھر کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس نے پولیس کے روزنامچے کو قرآن کہہ کر قرآن کریم کی بے حرمتی کی ہے اس لیے اس کے خلاف کاروائی کی جائے۔ مولانا محمد اجمل خان کا انداز اس قدر پرجوش اور خطیبانہ تھا کہ عدالت میں کہرام مچ گیا سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور عدالت درہم برہم ہوگئی۔ اس دوران ایک نوجوان نے، جو ملزموں کی صف میں تھا، پوری قوت کے ساتھ اپنا سر سامنے کی دیوار کے ساتھ ٹکرا دیا، دیکھنے والوں کو یوں نظر آیا کہ جیسے اس نوجوان کا سر پھٹ گیا ہوگا اور وہ ابھی زمین پر گر پڑے گا لیکن بچاؤ ہو گیا۔ عدالت برخاست ہوگئی اور اس کے بعد پھر یہ عدالت نہ لگ سکی اس لیے کہ لاہور ہائی کورٹ نے اس مارشل لاء کو ہی دستور کے خلاف قرار دے دیا جس کے تحت یہ عدالت قائم ہوئی تھی۔ اس واقعہ کو یاد کر کے میں سوچا کرتا ہوں کہ وہ نوجوان اس وقت سر ٹکرانے کے اس عمل میں جاں بحق ہو جاتا تو پولیس نے اسے خودکشی ہی کی کاروائی قرار دینا تھا لیکن کیا یہ واقعتاً خودکشی ہوتی؟ امید واثق ہے کہ بالآخر عامر چیمہ کی شہادت کا سراغ بھی مل ہی جائے گا۔

(روزنامہ پاکستان۔ ۱۷ مئی ۲۰۰۶ء)

(۲)

۲۷ مئی جمعرات کو چند گھنٹے فیصل آباد کی نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی میں گزارنے کا موقع ملا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت وناموس پر جان کا نذرانہ پیش کرنے والے قوم کے قابل فخر سپوت عامر عبد الرحمان شہیدؒ کی یاد میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ عامر چیمہ شہید نے اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور ٹیکسٹائل انجینئرنگ میں ڈگری کے حصول کے بعد مزید تعلیم کے لیے جرمنی میں مقیم تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخانہ خاکوں کی صورت میں سامنے آنے والی توہین و بے حرمتی پر بے چین ہوگیا اور حرمتِ

رسولؐ پر جان کی قربانی کی سعادت پا گیا۔

نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی کی لٹریری سوسائٹی نے ''عامر چیمہ شہید کانفرنس'' کے عنوان سے اس تقریب کا اہتمام کیا۔ عامر شہیدؒ کے والد محترم پروفیسر محمد نذیر چیمہ اور ان کی اہلیہ محترمہ کانفرنس میں مہمان خصوصی تھے اور راقم الحروف کو مہمان مقرر کے طور پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں پروفیسر نذیر احمد چیمہ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ہی گوجرانوالہ سے فیصل آباد پہنچا تھا۔ یونیورسٹی میں جتنی دیر رہے، عامر چیمہ شہیدؒ کا ہی تذکرہ رہا، اس کے متعدّد اساتذہ سے گفتگو ہوئی۔ اس کے ساتھی طلبہ نے اپنے شہید ساتھی کے دلچسپ واقعات و حالات سے آگاہ کیا۔ بالخصوص شہیدؒ کے بے تکلف دوست اور ساتھی ہارون نے اپنے ساتھی کی زندگی کے کئی دلچسپ گوشوں سے پردہ اٹھایا جن میں سے ایک کا تذکرہ اس موقع پر کرنا چاہوں گا۔

ہارون نے بتایا کہ جب وہ دونوں تعلیم کے آخری سال میں تھے تو ٹیکسٹائل کالج میں داخلہ اور تعلیم کی فیسوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا جس پر احتجاج کے لیے انہوں نے ''کالج بچاؤ تحریک'' کا آغاز کیا۔ اور طلبہ کی تحریکیں جیسی ہوتی ہیں، اسی رخ پر یہ تحریک آگے بڑھی۔ اس موقع پر عامر شہیدؒ کے والد محترم پروفیسر نذیر چیمہ نے بتایا کہ انہوں نے عامر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ تم آخری سال میں ہو اور فیسیں فرسٹ ایئر کی بڑھی ہیں، تمہیں اس قدر تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ عامر شہیدؒ نے جواب دیا کہ فرسٹ ایئر والے تو احتجاج کی پوزیشن میں نہیں ہیں، انہیں معلوم ہی نہیں کہ کرنا کیا ہے، اس لیے یہ ذمہ داری ہم سینئرز کی ہے کہ ہم ان کے لیے جدوجہد کریں اور انہیں زیادتی سے بچانے کی کوشش کریں۔ ہارون نے بتایا کہ جب اس سلسلہ میں ہم گفتگو کے لیے متعلقہ محکمہ کے سیکرٹری کے پاس گئے تو ان سے بات چیت کرتے ہوئے عامر شہیدؒ نے کہا کہ سر! فیسیں جس طرح بڑھائی گئی ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ اپنی تنخواہ اور جائز مراعات کے دائرے میں اپنی اولاد میں سے کسی کو ٹیکسٹائل کالج میں پڑھانا چاہیں تو کیا موجودہ فیسوں کے ساتھ آپ اپنے کسی بچے کو یہ تعلیم دلا سکتے ہیں؟ ہارون کا کہنا ہے کہ عامر شہیدؒ کی یہ بات وفاقی سیکرٹری کو اپیل کر گئی اور وہ فیسوں میں کمی کرانے کی مہم میں کامیاب ہو گیا۔

عامر چیمہ مرحوم کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کالج میں کسی بھی حوالہ سے اور کسی بھی طرف سے

زیادتی کا شکار ہونے والے طلبہ کی پناہ گاہ تھا۔ اور جس طالب علم کو بھی کوئی شکایت ہوتی وہ اس اعتماد کے ساتھ عامر چیمہ شہیدؒ کی طرف رجوع کرتا کہ اب اس کا کام ہو جائے گا اور اکثر ایسا ہو جایا کرتا تھا۔

عامر چیمہ شہیدؒ کی یاد میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں اس کے والد محترم، والدہ محترمہ اور اس کے دوست ہارون کے علاوہ لٹریری سوسائٹی کے سرپرست جناب اسحاق بھٹی، صدر اسماعیل عثمان اور شہیدؒ کے دیگر ساتھیوں نے بھی خطاب کیا اور اپنے شہید ساتھی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحفظ ناموس رسالتؐ کے سلسل میں اس کے مشن کے ساتھ ہم آہنگی اور اسے جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان میں سے چند ایک کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

مغرب کو یہ اعتراض ہے کہ مسلمان جذباتی قوم ہے، اس میں برداشت نہیں ہے، اختلاف سننے کا حوصلہ نہیں ہے اور قرآن کریم اور حضرت محمدؐ کے بارے میں ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے حوالہ سے جذباتی ہیں اور اسے ایمان و غیرت کی علامت سمجھتے ہیں۔ دنیا میں آج بھی کوئی مسلمان آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو جناب رسول اللہؐ کی توہین یا قرآن کریم کی بے حرمتی کو برداشت کر لے۔ اسے اس پر غصہ آئے گا اور وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ یہ قرآن کریم اور جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ مسلمانوں کی محبت اور تعلق کی علامت ہے جو بحمد اللہ تعالیٰ آج بھی قائم ہے اور اس کی قوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مگر یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ ہم اختلاف برداشت نہیں کرتے اور علمی تنقید پر بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ تین صدیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ مغرب کی یونیورسٹیاں اور دانش گاہیں اسلام پر، قرآن کریم پر، جناب نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر، اور اسلامی احکام و قوانین پر مسلسل اعتراضات کر رہی ہیں۔ بہت سے مستشرقین کا تو موضوع ہی یہی ہے، سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مقالات اور کتابیں اب تک سامنے آچکی ہیں مگر کسی پر مسلمانوں نے برا نہیں منایا۔ دلیل کا جواب دلیل سے دیا ہے، کتاب کا جواب کتاب کی صورت میں آیا ہے، اور تحقیق و استدلال کا سامنا تحقیق و استدلال کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن ہم نے اختلاف اور استہزاء میں فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، تنقید اور توہین کے درمیان فاصلوں کو کراس کرنے کی کسی کو اجازت نہیں دی اور نہ ہی آئندہ کسی کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار ہیں۔

سر ولیم میور نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر کتاب لکھ کر اعتراضات کیے تو اس کا جواب سر سید احمد خان مرحوم نے کتاب کی صورت میں دیا، لیکن سلمان رشدی نے اسی طرز کی باتیں تمسخر اور توہین کے لہجے میں لکھیں تو وہ مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت ہوگئیں۔

نامور ہندو مذہبی رہنما پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں قرآن کریم پر اور آنحضرتؐ کی ذات گرامی پر سینکڑوں اعتراضات کیے تو ان کا جواب مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ روبرو مکالمہ کی صورت میں دیا۔ جبکہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے اس کے جواب میں ''حق پرکاش'' کے نام سے کتاب لکھ کر اس کا قرض چکایا۔ لیکن جب راجپال نے ''رنگیلا رسول'' کے نام سے گستاخانہ کتاب لکھی تو اس کا جواب علماء کرام نے نہیں بلکہ غازی علم الدین شہیدؒ نے دیا۔

مغرب اور اس کے ہمنوا دانشوروں کو اس بات پر پریشانی ہوتی ہے کہ مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کو آخر جرم ہی کیوں سمجھتے ہیں؟ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا کون سا ملک ہے جس میں ''ازالۂ حیثیت عرفی'' کے حوالہ سے قانون موجود نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں ہر صاحب حیثیت شخص کو اپنی ''حیثیت عرفی'' کے تحفظ اور دفاع کا حق حاصل ہے۔ اور کسی ملک میں یہ صورتحال نہیں ہے کہ اپنی حیثیت عرفی کے مجروح ہونے پر کوئی شخص قانون کا دروازہ کھٹکھٹائے تو اسے یہ جواب ملے کہ تحمل سے کام لو، برداشت کرو، صبر کرو اور خواہ مخواہ غصے میں نہ آؤ قانون ہر جگہ اس کو دادرسی کی سہولت دیتا ہے اور ہتک عزت اور حیثیت عرفی کے مجروح ہونے کا نوٹس لیتا ہے۔

میرا سوال یہ ہے کہ ہم میں سے تو ہر شخص کی حیثیت عرفی ہے جس کے دفاع کا اسے حق حاصل ہے، لیکن کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کے معصوم پیغمبروں کی (نعوذ باللہ) کوئی حیثیت عرفی نہیں ہے جس کے مجروح ہونے پر قانون کو حرکت میں لانا ضروری ہو؟ جناب رسول اکرمؐ کی ''حیثیت عرفی'' کے بارے میں مائیکل ہارٹ سے پوچھ لیجئے جو آج بھی دنیا کے سو بڑے آدمیوں کی فہرست بناتے ہوئے حضرت محمدؐ کو پہلا نمبر دینے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۳۰ مئی ۲۰۰۶ء غالباً)

مولوی محمد یونس خالصؒ

مولوی محمد یونس خالصؒ کی وفات کی خبر قومی اخبارات میں نظر سے گزری، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حالات کے اتار چڑھاؤ کا کرشمہ ہے کہ ان کی وفات کی یہ خبر پاکستان کے بہت سے قومی اخبارات کے ایک کونے میں جگہ پاسکی۔ ورنہ اگر زمانہ ناقدری کا خوگر نہ ہوتا اور لوگوں میں محسن کشی اور احسان ناشناسی اس قدر غلبہ نہ پاچکی ہوتی تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کے قومی اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ میں مولوی محمد یونس خالص کا تذکرہ پاکستان کے ایک محسن کے طور پر کیا جاتا بلکہ امریکہ اور مغرب کا میڈیا بھی ان کا تذکرہ اس طور پر کرتا کہ افغانستان کا وہ عظیم رہنما دنیا سے رخصت ہوگیا ہے جس نے سوویت یونین کو شکست دینے اور سرد جنگ میں مغرب کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا، لیکن احسان ناشناسی بلکہ محسن کشی کے اس دور میں اس انصاف کی توقع کس سے کی جاسکتی ہے!

مولوی محمد یونس خالص شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے بلکہ اکوڑہ خٹک میں جب شیخ الحدیث نے دارالعلوم حقانیہ کا آغاز کیا تو ان کے ابتدائی رفقاء میں مولوی محمد یونس خالص بھی شامل تھے۔ وہ انتہائی حوصلہ مند اور جری علماء میں سے تھے، جب افغانستان میں سوویت یونین نے اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے لیے فوجیں اتاریں اور افغانستان کو کمیونسٹ ممالک کے کیمپ میں شامل کرنے کی غرض سے طاقت اور جبر کا راستہ اختیار کیا تو جن حریت پسندوں نے روسی استعمار کی اس عسکری جارحیت کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کیا ان میں مولوی محمد یونس خالص بھی تھے۔ انہوں نے دیگر علماء کرام کے ساتھ مل کر روس کی فوجی جارحیت اور نظریاتی یلغار کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور عملی طور پر جہاد کا آغاز کیا۔

جہاد افغانستان کے ابتدائی سالوں میں جب کسی کو اس جہاد کی کامیابی بلکہ پیش رفت کا یقین نہیں تھا اسے مولویوں کا جنون کہہ کر مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جہادی رہنما اپنی حمایت و معاونت کا سب سے بڑا سرچشمہ عالم اسباب میں پاکستان کے دینی حلقوں اور غیور عوام کو تصور کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر مجاہدین کے کنٹرول تک امریکہ سمیت مغربی ممالک یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے کہ یہ جنگ لڑی جاسکتی ہے اور اسے جیتا بھی جاسکتا ہے۔ اس دور کی بات ہے کہ مولوی محمد یونس خالص پاکستان کے مختلف شہروں میں آئے اور ہم نے شیرانوالہ لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، فیصل

آباد اور دیگر شہروں میں ان کے لیے علماء کرام کے اجتماعات کا اہتمام کیا تاکہ وہ انہیں جہاد افغانستان کی اہمیت سے آگاہ کر سکیں اور اپنا موقف سمجھا سکیں۔ اس کے بعد ان سے بہت ملاقاتیں ہوئیں اور کئی محافل میں شرکت ہوئی۔ میں نے مولوی محمد یونس خالص مرحوم کو آخری بار قندھار میں اس دور میں دیکھا جب طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن ابھی کابل ان کے کنٹرول میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مصالحتی مشن کے سلسلہ میں قندھار آئے ہوئے تھے اور ''حرکت انقلاب اسلامی افغانستان'' کے سربراہ مولوی محمد نبی محمدیؒ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ اس کے بعد میں ان دونوں بزرگوں کو نہیں دیکھ سکا البتہ اخبارات میں مختلف حوالوں سے ان کی خبریں وقتاً فوقتاً نظر سے گزرتی رہیں۔

گزشتہ دنوں اخبارات میں مولوی محمد یونس خالصؒ کی وفات کی خبر پڑھی تو بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہونے لگیں اور افغانستان کے علماء کرام اور مجاہدین کے ایک حوصلہ مند قائد کی تگ و تاز کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں، ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں، ان کی حسنات کو قبولیت سے نوازیں اور ان کی ان تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے اسباب مہیا کریں جن کو سامنے رکھ کر مولوی محمد یونس خالص اور دیگر جہادی رہنماؤں نے جہادِ افغانستان کی طرف عملی قدم بڑھایا تھا، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۸ جولائی ۲۰۰۶ء)

نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم

نواب محمد اکبر خان بگٹی کے افسوسناک قتل نے جہاں ماضی کی بہت سی تلخ یادوں کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے وہاں مستقبل کے حوالہ سے بھی انجانے خدشات و خطرات کی دھند ذہنوں پر مسلط کر دی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو کچھ ہوا ہے درست نہیں ہوا اور اس کے نتائج ملک و قوم کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں، اس پر حکومتی پارٹی اور اپوزیشن میں اختلاف نہیں ہے اور متحدہ مجلس عمل اور اے آر ڈی کے ساتھ ساتھ چودھری شجاعت حسین اور میر ظفر اللہ خان جمالی بھی اس پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے اسباب و محرکات اور اس قتل کی ذمہ داری کے حوالہ سے مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں اور بحث و مباحثہ کا نیا بازار گرم ہو گیا ہے۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی کا نام پہلی بار میں نے اس وقت سنا جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے زمام اقتدار سنبھالی اور سرحد و بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مخلوط حکومتیں بنائیں۔ سرحد میں مولانا مفتی محمودؒ اور بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل ان مخلوط حکومتوں کے سربراہ تھے۔ لیکن یہ مخلوط حکومتیں ابھی دس ماہ بھی کام نہ کر پائی تھیں کہ بلوچستان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل کی وزارت کو وفاق کی طرف سے برطرف کر دیا گیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر اسلام آباد میں عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی کا مسئلہ سامنے آیا جس کا تعلق خان عبدالولی خان اور سردار عطاء اللہ خان مینگل کی نیشنل عوامی پارٹی سے جوڑا گیا اور پھر نیشنل عوامی پارٹی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں ریفرنس دائر کر دیا گیا جو حیدرآباد ٹریبونل کے سامنے کئی برس تک زیر سماعت رہا۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی اس موقع پر بلوچستان کی ایک قد آور شخصیت کے طور پر بھٹو حکومت کے اقدامات کے حامی کے طور پر سامنے آئے اور انہوں نے موچی دروازہ لاہور میں جلسہ عام سے خطاب بھی کیا۔ اس مرحلہ میں بلوچستان میں مری اور مینگل قبائل کے علاقوں میں فوجی ایکشن ہوا، ان قبائل کے لوگ حسب روایت پہاڑوں پر چڑھ کر مورچہ زن ہو گئے اور پاک فوج اور قبائل کے درمیان مسلح کشمکش کے ایک دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کشمکش میں نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھی تھے اور ان کی طرف سے کچھ عرصہ بلوچستان کے گورنر بھی رہے۔ اسی دور میں اپوزیشن کی جماعتوں نے مل کر ”متحدہ جمہوری محاذ“ قائم کیا جس نے حکومت کے خلاف ملک گیر سیاسی مہم کا سلسلہ شروع کیا اور پنجاب کے گورنر جناب غلام مصطفیٰ کھر کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ کو ہدف بنا کر لاہور اور ملتان سے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اس تحریک میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کرنے والوں میں ملک محمد قاسم، سید محمد قسور گردیزی، جناب حمزہ، قاری نور الحق قریشی اور متعدد سرکردہ سیاسی رہنما شامل تھے۔ سیاسی کارکنوں پر لاہور اور ملتان دونوں جگہ سخت تشدد کیا گیا، ملک محمد قاسم مرحوم زخمی ہوئے، میاں محمد طفیل جیسی محترم شخصیت تذلیل کا نشانہ بنی، شیرانوالہ لاہور کے مولوی شیر محمد پر بازاری عورتیں مسلط کی گئیں، اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کو گرفتار کر کے

بلوچستان کی مچھ جیل میں ڈال دیا گیا۔

ان دنوں میں نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے دریافت کیا کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تو ہمارے معمولات میں شامل ہے اور یہ اکثر ہمارے اضلاع میں نافذ ہوتی رہتی ہے، اس پر اس قدر سخت ایکشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ مفتی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی دراصل ہم بلوچستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے کر رہے ہیں اور فوجی آپریشن کا نشانہ بننے والے بلوچوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومتی کارروائیوں اور ریاستی تشدد کا ان کی طرح ہم بھی نشانہ ہیں۔ اس طرح ہماری کوشش ہے کہ پنجاب کے عوام اور سیاسی کارکن اس انداز میں قربانیاں دیں تاکہ بلوچ قبائل پر فوج کے اس آپریشن کو پنجاب کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے۔ چودھری ظہور الٰہی مرحوم جب مچھ جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے بھی ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم بلوچ عوام کے ساتھ ہیں اور ان کے ساتھ ہم آہنگی کے اظہار کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں خود اس جلسہ کے منتظمین میں سے تھا اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے بلوچ عوام کی مظلومیت کا جو نقشہ کھینچا اور مچھ جیل میں زیر حراست بلوچوں کی بے بسی کے جو مناظر پیش کیے اس نے جلسہ میں شریک ہر آنکھ کو نم کر دیا تھا۔

بلوچستان میں جمعیۃ علماء اسلام کے صوبائی امیر اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر مولوی سید شمس الدین شہیدؒ کی المناک شہادت کا واقعہ بھی اسی دور کا ہے۔ مولوی سید شمس الدین شہیدؒ کا تعلق ژوب سے تھا، انہوں نے میرے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے دورۂ حدیث کیا تھا۔ فراغت کے بعد وطن واپس پہنچے تو الیکشن کا طبل بج چکا تھا، وہ نوجوان تھے اور الیکشن لڑنے کے لیے ۲۵ سال کی عمر کی حد بمشکل پوری کر پائے تھے۔ اپنے علاقے کے نواب کے مقابلے میں وہ صرف اس نیت سے کھڑے ہوئے کہ وہ بلا مقابلہ نہ منتخب ہو جائے۔ انہوں نے سائیکلوں پر انتخابی مہم چلائی اور خلاف توقع الیکشن جیت گئے۔ انہیں قادیانیوں کے خلاف ژوب میں ایک تحریک کے حوالہ سے گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا۔ کئی ماہ تک ان کی بازیابی اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ مولانا مفتی محمودؒ کو قومی اسمبلی میں یہ کہنا پڑا کہ اگر انہیں مار دیا گیا ہے تو ان کی لاش تو ورثاء کے حوالے کر دی جائے۔ وہ رہا تو ہوئے مگر چند دنوں کے

بعد انہیں شہید کر دیا گیا۔

یہ اس دور کی باتیں ہیں جب ہمارا یعنی جمعیۃ علماء اسلام کے کارکنوں کا نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم سے پہلا تعارف ہوا بلکہ ان سے واسطہ پڑا۔ پھر اس کے بعد وہ دور بھی آیا جب جمعیۃ علماء اسلام نے نواب اکبر خان بگٹی مرحوم کے ساتھ مل کر بلوچستان میں حکومت بنائی۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بعد ایک الیکشن میں بلوچستان اسمبلی میں نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سربراہی میں کولیشن قائم ہوئی اور ان کی قیادت میں صوبائی حکومت بنائی گئی جس میں جمعیۃ علماء اسلام بھی شامل تھی۔ نواب اکبر خان بگٹی کا تعارف ایک سیکولر سیاستدان اور قوم پرست رہنما کا تھا۔ وہ سیاست میں مذہب کی چھاپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور خالصتاً قوم پرستانہ سیاست کے قائل تھے۔ ان کے اس سیاسی پس منظر کے پیش نظر مجھے اس کولیشن پر تعجب ہوا۔ جمعیۃ علماء اسلام اس وقت فضل الرحمان گروپ اور درخواستی گروپ میں منقسم تھی۔ میں درخواستی گروپ کے ذمہ دار حضرات میں شامل تھا اس کے باوجود ایک موقع پر مولانا فضل الرحمان سے ملاقات کے دوران میں نے ان سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھا کہ نواب اکبر بگٹی مرحوم کے ساتھ بلکہ ان کی قیادت میں جمعیۃ علماء اسلام کی کولیشن کے اسباب کیا ہیں؟ مولانا فضل الرحمان نے اس کا جو جواب دیا وہ اس موضوع گفتگو سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے اس کا ذکر یہاں نہیں کر رہا، البتہ یہ بات بتانا چاہ رہا ہوں کہ جمعیۃ علماء اسلام اور بگٹی مرحوم کی یہ کولیشن وزارت کئی برس تک چلتی رہی۔

نواب اکبر خان بگٹی ایک جہاندیدہ اور صاحب مطالعہ سیاستدان تھے، معاملات کو سمجھتے تھے، اور موقع محل کے مطابق مشکل ترین حالات میں بھی راستہ نکالنے کے فن سے واقف تھے۔ لیکن ان کی سوچ اور سیاسی فکر بلوچ قومیت تک محدود رہی جس کی وجہ سے وہ قومی سیاست میں اپنی صحیح جگہ نہ پا سکے۔ ورنہ ان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ اگر وہ بلوچ قوم پرستی کے دائرے سے نکل کر سیاست کے قومی دھارے میں وسیع ذہن کے ساتھ آتے تو قومی سطح کے سیاستدانوں کی صف میں نمایاں جگہ پا سکتے تھے۔ بلکہ مختلف علاقائی قوم پرستانہ تحریکوں کے سنگم کے طور پر ان تحریکوں کو وفاقی لیڈر شپ بھی فراہم کر سکتے تھے۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سوچ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا ہے لیکن ان

کے قتل اور بلوچ قبائل کے خلاف اس طرح کے فوجی ایکشن کی کسی طرح حمایت نہیں کی جاسکتی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اسے صریحاً ظلم اور ناعاقبت اندیشی ہی قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس کے خلاف اپوزیشن نے یکم ستمبر کو ہڑتال کی جو کال دی ہے وہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔ بھٹو حکومت کے دور میں بلوچستان پر ہونے والے فوجی ایکشن کے خلاف پنجاب سمیت ملک بھر کے سیاسی کارکنوں نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا اسے پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کو نمایاں کردار ادا کرنا چاہیے کہ ان دو عظیم رہنماؤں کا سیاسی ورثہ یہی ہے۔ اس سلسلہ میں اطمینان کی ایک بات ہے یہ کہ آج اس احتجاج میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پارٹی بھی شریک ہے اور بلوچ عوام کے جائز حقوق کی حمایت کر رہی ہے۔ بلوچستان آج پھر فوجی آپریشن کی زد میں ہے، بلوچ عوام کو پھر کارنر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور بلوچستان ایک بار پھر پنجاب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ امید ہے کہ پنجاب اپنا فرض بخوبی نبھائے گا۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ یکم ستمبر ۲۰۰۶ء)

صدام حسین مرحوم

(۱)

عید قربان پر سابق عراقی صدر صدام حسین امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی انا کی سولی پر لٹک گئے اور اتحادیوں نے عید کے روز عراقی عوام اور امت مسلمہ کو صدام حسین کی لاش کا تحفہ دے کر ایک بار پھر دنیا کو بتا دیا کہ مسلم دنیا میں امریکہ کی "ون قطبی طاقت" کے سامنے جھکنے سے انکار کرنے والوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اتحادی جب چاہیں اپنے باغیوں کی گردن میں پھندا فٹ کر کے انہیں زندگی کے حق سے محروم کر سکتے ہیں۔

صدام حسین دنیا میں عرب نیشنلزم کے اس عنصر کے نمائندہ کے طور پر عراق کے حاکم بنے تھے جس نے مذہب بیزاری کے جلو میں عرب قومیت کا پرچم بلند کیا تھا اور بائیں بازو کے افکار کی بنیاد پر عراقی نیشنلزم کی نیو اٹھائی تھی۔ وہ بعث پارٹی کے رہنما تھے جو سیاست میں مذہب کی ملاوٹ کے خلاف ہے بلکہ اجتماعی معاملات میں مذہب کے کردار کی نفی کو ضروری سمجھتی ہے۔ لیکن ان کی زندگی کا اختتام

اس کیفیت میں ہوا کہ قرآن کریم ان کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے پھانسی گھاٹ کی طرف جانے سے قبل نماز پڑھی اور جب پھانسی کے تختے کی طرف بڑھے تو اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے تختے پر کھڑے ہو گئے۔ پھر بعض خبروں کے مطابق انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھا اور جب جلاد نے ان کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ کرتے ہوئے کہا کہ ''جہنم میں جاؤ'' تو صدام حسین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ''جنت میں جاؤں گا''۔ اور پورے وقار کے ساتھ منہ پر ماسک پہننے سے انکار کرتے ہوئے تختہ دار پر جھول گئے۔ اس سے قبل انہوں نے دعائیہ جملہ کے طور پر یہ آخری الفاظ کہے کہ ''عراق سلامت رہے اور فلسطین عربوں کا ہے''۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے''۔ یعنی جو شخص جس حالت میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے آخرت کے معاملات اسی حوالے سے طے پاتے ہیں۔ اس لیے صدام حسین کے آخری لمحات کی کیفیات کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انہیں سرخروئی حاصل ہوگی اور ان کی زندگی کے یہ آخری لمحات ان کے متنازعہ ماضی کا کفارہ بن جائیں گے۔ مجھے صدام حسین کی زندگی کے آخری لمحات دیکھ کر حجاج بن یوسف یاد آگیا، وہ بھی عراق کا حاکم تھا، اس نے بھی اہل دین کے خلاف ظلم وجبر کی انتہا کر دی تھی۔ اس نے سلطنت کے استحکام کو باقی ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہوئے ہزاروں صالحین کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ اس نے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر کے بیت اللہ پر سنگباری کی تھی اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت سعید بن جبیرؒ جیسے اساطین امت کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ لیکن اس کے کھاتے میں بڑی بڑی نیکیاں بھی ہیں۔ سندھ کے راجہ داہر کے ہاتھوں چند مسلمان خواتین کی گرفتاری پر اسی نے غیرت کھا کر اپنے بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں لشکر تیار کیا تھا اور دمشق کی خلافت سے اس لشکر کی روانگی کی اجازت طلب کر کے اسے سندھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ بعض روایات کے مطابق قرآن کریم پر اعراب لگوانے کا کام بھی اسی کی نگرانی میں تکمیل تک پہنچا تھا جس کی وجہ سے غیر عربوں کے لیے قران کریم کی براہ راست تلاوت آسان ہو گئی۔

حجاج بن یوسف کی زندگی متضاد کارناموں کا مجموعہ ہے لیکن بعض حضرات نے اس کی زندگی کے آخری لمحات کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ مرض الموت میں اس کی بوڑھی ماں نے اسے اس کے مظالم یاد دلاتے ہوئے جب کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کس منہ سے پیش ہوگا؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ

ماں مجھے ڈراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ تجھ سے کہیں زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔ ایک بار میں نے ایک عوامی خطاب کے دوران حجاج بن یوسف کی وفات سے قبل کے لمحات اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت پر اس کا یہ یقین قدرے تفصیل سے بیان کیا تو ایک صاحب نے مجھ سے سوال کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اگر حجاج بن یوسف کو بخش دیں گے تو ان ہزاروں مظلوموں کا کیا بنے گا جن کے بے گناہ خون سے اس نے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ میں نے بعض بزرگان دین کے حوالے سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو بخشنا چاہتے ہیں تو اس کے مظالم کا بدلہ کئی گنا اپنی طرف سے مظلوموں کو ادا کر کے اس کی بخشش کا اہتمام کر دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی کی کوئی ادا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدگی کا درجہ پالے تو باقی مراحل اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے طے فرما دیتے ہیں اور یہ نہ انصاف کے خلاف ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہے۔

صدام حسین کی زندگی بھی ایسے ہی تضادات سے عبارت رہی ہے۔ وہ اصلاً اس عرب نیشنلزم کے علمبردار تھے جس کی بنیاد بعث پارٹی نے مذہب کی نفی پر رکھی تھی اور وہ عالمی سیاست میں بائیں بازو کی نظریاتی سیاست کی نمائندگی کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم کی اٹھان ترکی کی خلافت عثمانیہ کی صدیوں کی حکمرانی کے ردعمل کے طور پر عربوں کی آزادی کے تصور کے ساتھ ہوئی تھی۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی راہ ہموار کرنے والوں نے جس طرح ترکوں کو یہ سبق پڑھایا تھا کہ وہ یورپین ہیں اور بالاتر قوم ہیں اس لیے ان کا عربوں کے نتھی رہنا ان کے روشن مستقبل کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، اسی طرح عربوں کو بھی اس دور میں یہ سبق پڑھایا گیا تھا کہ وہ عرب ہیں اور عجمیوں کا ان پر حکمران ہونا عربوں کی بالاتری کے منافی ہے اس لیے انہیں ترکی کی خلافت عثمانیہ سے جلد از جلد نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ اس ''عرب نیشنلزم'' کے مختلف پہلو اور متعدّد جہات تھیں:

1. ایک جہت مذہبی تھی جس کا اظہار خلافت عثمانیہ کی طرف سے مکہ مکرمہ کے گورنر شریف مکہ سید حسین ہاشمی کی اس بغاوت کی صورت میں ہوا جس کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ ترکی والے عجمی ہیں اور ظالم ہیں انہیں خلافت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ خلیفہ اسلام کے لیے قریشی ہونا شرط ہے اور غیر قریشی خلیفہ اسلام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شریف مکہ حسین نے جو قریشی اور ہاشمی تھے، برطانوی استعمار کے اس وعدے پر ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی کہ

انہیں عرب دنیا کا خلیفہ تسلیم کر لیا جائے گا۔ لیکن جب بغاوت کامیاب ہوئی اور ترکوں کو سرزمین عرب سے نکال دیا گیا تو شریف مکہ کے بیٹوں کو عراق اور اردن کی حکمرانی دے کر سرزمین حجاز پر آل سعود کا خاندانی اقتدار تسلیم کر لیا گیا، جبکہ اسی شریف مکہ کے ایک بیٹے کو عراق کا حکمران بنا دیا گیا جس نے ہاشمی ہونے کے ناتے سے عراق کی جداگانہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

2. لیکن عرب نیشنلزم کا دوسرا پہلو جس کی بنیاد مذہب کی بجائے سیکولرازم پر تھی اس نے انقلاب کے ذریعے اس کا تختہ الٹ دیا۔ جنرل عبدالکریم قاسم اور بعث پارٹی عرب قومیت کے اسی ونگ کی قیادت کر رہے تھے اور صدام حسین کے اقتدار کا آغاز بھی اسی حوالے سے ہوا تھا۔

3. عرب قومیت کا ایک تیسرا رخ بھی تھا جو سعودی عرب کی مذہبی عرب قومیت اور بعث پارٹی کی سیکولر عرب قومیت، دونوں سے مختلف تھی۔ اس کی قیادت مصر کے جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی جو نہ تو سعودی عرب کی طرح ملک میں شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے تیار تھے اور نہ ہی بعث پارٹی کی طرح مذہب کی نفی کرتے تھے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد عرب قومیت ان تین رخوں پر آگے بڑھتی رہی، آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے بھی رہے، سرد جنگ کے دوران امریکہ اور روس کے کیمپوں میں تقسیم بھی رہے اور بہت سے عرب ملکوں میں اس بنیاد پر تقسیم اور انقلابات بھی رونما ہوئے۔ لیکن ان تمام جھگڑوں کے باوجود عرب قومیت ان سب میں قدرِ مشترک چلی آ رہی ہے اور عرب لیگ کے فورم پر آج بھی سب مل کر فیصلے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایران میں مذہبی انقلاب کی کامیابی کے بعد عرب دنیا میں اس کے نفوذ اور رسوخ کے امکانات واضح ہونے لگے تو صدام حسین نے ایران کے ساتھ آٹھ سال تک مسلسل جنگ لڑ کر اس کا راستہ روک دیا۔ اس جنگ میں انہیں امریکہ کی پشت پناہی بھی حاصل تھی کہ امریکہ کے مستقبل کے ایجنڈے کے لیے یہ جنگ ضروری تھی، لیکن پوری عرب دنیا اس جنگ میں صدام حسین کے ساتھ تھی اور اس کے پس منظر میں یہی عرب قومیت کارفرما تھی جو ایک عجمی قوت کے عرب دنیا میں اثر و نفوذ کو روکنے کے لیے اس جنگ کو ناگزیر تصور کرتی تھی۔

صدام حسین کو ایران عراق جنگ میں دو حیثیتیں حاصل تھیں۔ ایک یہ کہ وہ عرب دنیا کو عجمی اثر و رسوخ سے محفوظ رکھنے کی جنگ لڑ رہے تھے اور دوسری یہ کہ وہ عرب دنیا میں اہل سنت اور اہل تشیع کی تقسیم کے پس منظر میں اہل سنت کے مفادات کا تحفظ کر رہے تھے۔ اس لیے ان کی پھانسی کے ذریعے موت کو عرب دنیا میں سنی شیعہ کشمکش بلکہ خانہ جنگی کے آغاز کا الارم تصور کیا جا رہا ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس موقع پر انہیں پھانسی دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے سنی شیعہ کشمکش کو خانہ جنگی کے ہدف تک لے جانا مقصود ہے جس کا دائرہ صرف عراق تک محدود نہیں رہے گا بلکہ کویت، بحرین، لبنان اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار پوری عرب دنیا کے اس میں ملوث ہونے کا امکان موجود ہے۔ اور عرب دنیا میں تیزی سے بڑھتے ہوئے مذہبی رجحانات سے اسرائیل کو محفوظ رکھنے اور امریکی مفادات کو بچانے کے لیے اس سے زیادہ کامیاب نسخہ کوئی نہیں ہے۔ بہرحال اس تناظر میں صدام حسین اپنے حصے کا کام سرانجام دے کر بارگاہ ایزدی میں پیش ہو چکے ہیں، ان کے بہت سے کاموں سے اختلاف بلکہ شدید اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی زندگی کا آخری حصہ بہرحال استعمار کے خلاف جرأت و استقامت اور حوصلہ و عزیمت سے عبارت ہے اور اسی حوالے سے ہم بارگاہ خداوندی سے امیدوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں گے اور رحمت خداوندی انہیں اپنے سائے میں جگہ دے گی۔

(روزنامہ پاکستان۔ ۴ جنوری ۲۰۰۷ء)

(۲)

امریکی ذرائع کے مطابق عراق کے معزول صدر صدام حسین کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ اس وقت اتحادی فوجوں کی تحویل میں ہیں۔ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ انہیں تکریت کے علاقہ میں زیر زمین پناہ گاہ سے اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ سوئے ہوئے تھے، ان کے پاس دو رائفلیں اور متعدد دستی بم تھے اور لاکھوں ڈالر بھی ان کے پاس تھے، جبکہ ان کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر تھکن اور مشقت کے آثار تھے۔ ان کی ڈاڑھی سمیت تصویر اخبارات میں آئی ہے جس سے تاثر ملتا ہے کہ وہ حالت جنگ میں تھے اور آخر وقت تک ہتھیار بکف تھے مگر مخبروں کی مساعی کامیاب ہوئیں اور وہ انہیں اتحادی فوجوں کے شکنجے میں لانے کی کوشش میں بالآخر کامیاب ہو گئے۔ صدام حسین کا ڈی این اے ٹیسٹ لے کر تصدیق کر دی گئی ہے کہ وہ فی الواقع وہی صدام حسین ہیں جو عراق کے حکمران رہے ہیں اور

امریکہ کو مطلوبہ ہیں۔ ان کی ڈاڑھی صاف کر دی گئی ہے اور ڈاڑھی کے بغیر بھی ان کی تازہ تصویر مغربی ذرائع کے حوالے سے اخبارات کی زینت بنی ہے۔

صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے فوری طور پر پریس کانفرنس کر کے اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے اور اسے اتحادی فوجوں کی فتح قرار دیا ہے جبکہ اس بات پر ملے جلے تاثر کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ صدام حسین کی گرفتاری کے بعد عراق میں اتحادی فوجوں کے خلاف مزاحمت اور گوریلا کارروائیوں میں کمی آئے گی یا وہ پہلے سے زیادہ بڑھ جائیں گی۔

تقریباً ربع صدی تک عراق کے حکمران رہنے والے صدام حسین بعث پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے جس نے عرب دنیا میں عرب نیشنلزم کو فروغ دینے اور عراقی نیشنلزم کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عرب نیشنلزم یا علاقائی قومیتوں کا نسخہ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لیے مغربی دانشوروں اور حکمرانوں نے بڑی چابکدستی اور ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ اور عالم اسلام کے سیاسی مرکز خلافت عثمانیہ کو سبوتاژ کرنے میں وہ اس طرح کامیاب ہوئے تھے کہ عربوں کو عجمی ترکوں کی حکمرانی سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی اور جب وہ خلافت عثمانیہ کو بکھیر کر یہ آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں مصری، شامی، اردنی، عراقی، فلسطینی اور دیگر علاقائی قومیتوں کے دام ہمرنگ زمین میں الجھا دیا۔ اس کے ردعمل میں عرب دانشوروں کے ایک طبقہ نے ''علاج بالمثل'' کا طریقہ اختیار کیا کہ جس عرب قومیت یا علاقائی قومیتوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر کے اس خطہ میں مغربی ممالک کی دخل اندازی اور بالادستی کی راہ ہموار کی تھی اسی عرب قومیت اور علاقائی قومیتوں کو مغرب کی بالادستی کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہا۔ جمال عبد الناصر، احمد بن بیلا، ابراہیم عبود، عبد الکریم قاسم، معمر القذافی، نور الدین عطاشی اور دیگر متعدّد عرب لیڈروں کی حکمت عملی یہی تھی اور انہوں نے مغرب کی بالادستی اور مداخلت کا ذریعہ بننے والی عرب قومیت کو ہی مغرب سے نجات کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

سوویت یونین چونکہ ایک حریف کے طور پر امریکہ کے سامنے آچکا تھا اس لیے اس نے عرب قومیت کے اس نعرہ کی حمایت کی اور اسے سپورٹ کر کے اپنے حلقۂ اثر میں اضافہ کیا۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی خوفناک شکست نے پورا منظر تبدیل کر دیا اور قوم پرست عرب لیڈروں

کو بھی اپنی سیاست اور اقتدار بچانے کے لیے امریکہ کی دہلیز پر سجدہ ریز ہونا پڑا۔ صدام حسین بنیادی طور پر اسی کیمپ سے تعلق رکھتے تھے، وہ عرب قومیت اور پھر عراقی قومیت کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اسی نظریہ پر قائم بعث پارٹی کے لیے شب و روز محنت کی اور اقتدار تک جا پہنچے۔ بعث پارٹی کو ایک دور میں سوویت یونین کی سیاسی اور اخلاقی حمایت حاصل تھی لیکن مسابقت کی دوڑ میں اس کے پیچھے رہ جانے پر دیگر عرب قوم پرست لیڈروں کی طرح صدام حسین کو بھی امریکہ کی دوستی کے دائرہ میں آنا پڑا اور پھر وہ وقت بھی دنیا نے دیکھا کہ صدام حسین اس خطہ میں امریکہ کے دوستوں میں شمار ہونے لگے۔ انہیں ایران کے خلاف جنگ میں امریکہ کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی اور وہ اس وقت امریکہ کے بہترین دوستوں میں گنے جاتے تھے۔

مگر جب صدام حسین کی ضرورت نہ رہی یا دوسرے لفظوں میں امریکہ کو اسرائیل اور عراق میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو خلیج عرب کا منظر ایک بار پھر تبدیل ہو گیا۔ اب صدام حسین دوست نہیں بلکہ دشمن تھے، انہیں فراہم کی جانے والی قوت اور وسائل کی واپسی یا تباہی ضروری قرار پا گئی تھی۔ اس لیے انہیں ایک ایسے جال میں الجھا دیا گیا کہ اس کے نتیجے میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے قدم خلیج عرب میں جمتے چلے گئے اور آج خلیج عرب بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں ہیں، اسرائیل اور اس کی دہشت گردی ہے، اور ان دونوں کی طرف رحم طلب نگاہوں سے مسلسل دیکھنے والی سہمی سہمی سی عرب حکومتیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس منظر نامہ میں اور کسی بات کی گنجائش سر دست نظر نہیں آ رہی۔

صدام حسین کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا، ان کے جرائم کے ثبوت فراہم کیے جائیں گے اور انہیں قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔ یہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے، فاتحین نے اپنے قبضے میں آنے والے مفتوحین کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ یہ صرف جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی یا ان کی تعلیمات و ہدایات پر یقین رکھنے والے بعض خدا ترس جرنیل تھے جنہوں نے دشمنوں پر مکمل قبضہ اور دسترس رکھنے کے باوجود مختلف مواقع پر عفو و درگزر سے کام لیا۔ ورنہ فاتحین کی عدالتوں نے مفتوحین کے ساتھ دنیا میں کیا کچھ نہیں کیا؟ بلکہ یہ عدالتیں تو وہ ہیں جو انصاف کا معیار خود قائم کرتی ہیں، اس کا طریقہ کار خود وضع کرتی ہیں،

فیصلوں کی کسوٹی بھی خود ہوتی ہیں اور ان کے فیصلوں کے صحیح ہونے کے لیے صرف اتنی دلیل کافی ہوتی ہے کہ وہ فاتحین کی عدالتیں ہیں اور مفتوحین ان کے قبضہ واختیار میں ہیں۔

صدام حسین کے جرائم میں بہت سی باتیں شمار کی جاتی ہیں اور بہت سی ابھی شامل کی جائیں گی۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

- انہوں نے عراقی عوام کو جمہوری حقوق اور شہری آزادیوں سے محروم رکھا اور ان پر ایک صدی تک جبر کے ذریعہ حکومت کرتے رہے،
- انہوں نے بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے فیصلوں کی پاسداری نہیں کی اور من مانی سے کام لیتے رہے،
- انہوں نے عراق کے اہل تشیع اور کردوں کو وحشیانہ جبر وتشدد اور مظالم کا نشانہ بنایا،
- وہ اپنے اردگرد کی چھوٹی ریاستوں کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بنے رہے،
- اور انہوں نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کی بجائے اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔

اس نوعیت کی اور بھی بہت سی باتیں ان کے خلاف فرد جرم کا حصہ بنیں گی لیکن ہمارے نزدیک صدام حسین کا اصل قصور کچھ اور ہے جس کا دور دور تک کہیں تذکرہ نہیں ہوگا۔ وہ قصور ہے مغرب کی دوستی اور اس دوستی کا غلط مفہوم جس نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ صدام حسین نے ایک دور میں مغرب کو اپنا دوست سمجھا اور اس کے بہت سے تقاضے پورے کیے لیکن وہ غلط طور پر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ دوستی دو طرفہ ہے اور وقت آنے پر دوسری طرف سے بھی دوستی کے تقاضوں کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ جبکہ مغرب اس معاملہ میں ”ون وے ٹریفک“ کا عادی ہے۔ اس کے نزدیک دوستی کا مفہوم صرف یہ ہے کہ وہ جس کو اپنا دوست کہے وہ ضرورت کے مطابق اس کے کام آتا رہے اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ جونہی اس کی ضرورت ختم ہوگئی یا اس نے جوابی دوستی کا تقاضا کر دیا تو اس کا نام دوستوں کی فہرست سے کٹ جائے گا۔ صدام حسین کے پاس شاید وقت نہیں تھا ورنہ وہ فلپائن کے مارکوس اور ایران کے رضا شاہ پہلوی کا حشر ایک نظر دیکھ لیتے کہ مغرب اپنے دوستوں سے بالآخر کیا سلوک کیا کرتا ہے۔

بہرحال صدام حسین اپنے سابقہ دوستوں کی تحویل میں ہیں اور ان کے ساتھ وہ جو سلوک روا رکھیں گے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتا رہے گا۔ مگر ہمیں ان بہت سے دیگر ''صدام حسینوں'' پر ترس آرہا ہے جو مغرب کی دوستی کے سنہری جال میں مسلسل پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک جال کی سنہری تاروں سے ان کی نظریں نہیں ہٹ رہیں۔ انہیں کون بتائے گا کہ وہ رضا شاہ پہلوی، مارکوس اور صدام حسین سے مختلف نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ڈیل کرنے والے مغربی دوست رضا شاہ پہلوی، مارکوس اور صدام حسین کو ڈیل کرنے والوں سے کوئی الگ مخلوق ہیں۔ خدا ہی ان بے چاروں کے حال پر رحم فرمائے، آمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۳ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ

(۱)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ روز راولپنڈی میں ایک خودکش حملہ کے نتیجہ میں جاں بحق ہوگئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ملک بھر میں ان کا سوگ منایا جارہا ہے اور ہر طبقہ کے افراد ان کے اس المناک قتل کی مذمت کرتے ہوئے اس سوگ میں شریک ہیں۔ حکومت نے قومی سطح پر تین دن اور پاکستان پیپلز پارٹی نے چالیس روز تک سوگ منانے کا اعلان کیا ہے۔ اور اس دوران احتجاجی مظاہروں، تعزیتی اجتماعات اور قرآن خوانی کی محافل کے ساتھ ساتھ کاروباری زندگی تین روز سے تادمِ تحریر معطل ہے، توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہے، ریلوے کے انجن، گاڑیاں، بسیں، کاریں اور کوچیں سینکڑوں کی تعداد میں جلائی جاچکی ہیں اور بینک، دفاتر اور پٹرول پمپ بھی اس توڑ پھوڑ کی زد میں ہیں۔

اب تک سامنے آنے والی میڈیا رپورٹوں کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو نے زندگی کے آخری روز اسلام آباد میں افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے ملاقات کی اور لیاقت باغ میں ایک انتخابی جلسہ سے خطاب کیا لیکن جب وہ جلسہ سے خطاب کے بعد اپنی رہائش گاہ پر جانے کے لیے لیاقت باغ سے باہر نکل رہی تھیں تو حملہ کا نشانہ بن گئیں۔ کارکن ان کو دیکھ کر جوش و خروش سے نعرے لگانے لگے جس پر

انہوں نے کارکنوں کے نعروں کا جواب دینے کے لیے گاڑی کی چھت کھلوائی اور سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کارکنوں کے لیے خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔ اس دوران ان پر فائرنگ ہوئی اور ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور وہ گاڑی کے اندر گر گئیں، انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں اور ڈاکٹروں نے کم و بیش نصف گھنٹہ تک ان کی جان بچانے کی کوشش کے بعد ان کی موت کا اعلان کر دیا۔

وزارت داخلہ کے ترجمان اور ان کے ساتھ آخری وقت بے نظیر بھٹو کا علاج کرنے والے ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو کوئی گولی نہیں لگی بلکہ وہ گاڑی کی کھلنے والی چھت کا لیور سر پر لگنے سے زخمی ہوئیں اور ان کے سر کا یہ شدید زخم ان کی موت کا باعث بن گیا۔ ڈاکٹر صاحبان کے بقول گاڑی کے لیور سے لگنے والے اس زخم کے علاوہ ان کے جسم پر اور کسی قسم کے زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمان نے وزارت داخلہ کے اس موقف کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ وہ اس بات کی عینی شاہد ہیں کہ بے نظیر بھٹو کی گردن پر گولی لگی تھی اور وہ ان کے غسل میں بھی شریک تھیں اور اس موقع پر بھی انہوں نے گولی لگنے سے ہونے والے زخم سے خون رستے دیکھا ہے۔ ان دو متضاد بیانات سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کا سبب متعیّن کرنا بظاہر مشکل نظر آرہا ہے جبکہ بہت سے حلقوں کی طرف سے، جن میں امریکہ کی صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن بھی شامل ہیں، اس سانحہ کی عالمی سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے جس کے جواب میں وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے البتہ اگر بے نظیر بھٹو کے ورثاء چاہیں تو ان کا شک دور کرنے کے لیے قبر کشائی کر کے محترمہ بے نظیر بھٹو کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اخبار میں شائع ہونے والی یہ خبر بھی قابل توجہ ہے کہ ہسپتال سے محترمہ بے نظیر بھٹو کے علاج سے متعلقہ تمام ریکارڈ غائب کر دیا گیا ہے۔

دوسری طرف اس المناک سانحہ کی ذمہ داری کے حوالہ سے پہلے یہ خبر منظر عام پر آئی کہ ”القاعدہ“ نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور اس کے ترجمان نے کہا ہے کہ ہم نے ایسا کر کے امریکہ کا ایک قیمتی اثاثہ ختم کر دیا ہے لیکن اس کے بعد القاعدہ کی طرف سے اس کی تردید بھی آگئی ہے کہ اس کے کسی ترجمان نے یہ بیان نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہی وزارت داخلہ کے ترجمان کی طرف سے

وزیرستان کے ایک کمانڈر بیت اللہ محسود کی ایک اور صاحب کے ساتھ ہونے والی ٹیلی فون گفتگو کی تفصیل جاری کی ہے جس میں انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے اس کو بڑا کارنامہ قرار دیا ہے اور یہ کام کرنے والے کارکنوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی ہائی کمان ان کے جانشین کا انتخاب کر چکی ہوگی جس کے بارے میں اخباری قیاس آرائیاں یہ ہیں کہ آصف زرداری کی طرف سے پارٹی کی قیادت سنبھالنے سے معذرت کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو یا ان کے فرزند بلاول زرداری میں سے کسی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ بے نظیر بھٹو کے اس المناک قتل کے بعد ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد بھی سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے، ملک بھر میں تمام انتخابی سرگرمیاں معطل ہیں، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں محمد نواز شریف نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے، ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی ہائی کمان بھی الیکشن کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکی ہوگی اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر پی پی پی نے بھی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تو ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں رہے گا۔ مگر اس صورت میں آئینی الجھنوں سے نمٹنے کے لیے دوبارہ ایمرجنسی کا نفاذ بھی امکان سے باہر نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی حلقوں میں صدر مشرف کی حکومت کے مستقبل کا سوال بھی زیر بحث ہے اور کہا جا رہا ہے کہ جنرل (ر) پرویز مشرف پر اقتدار سے الگ ہونے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب اس دباؤ کا مزید مقابلہ نہ کر سکیں۔ شاید یہی صورتحال سامنے رکھ کر میاں نواز شریف نے الیکشن کے التواء اور ایک ایسی قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے جس میں پرویز مشرف کا کوئی کردار نہ ہو۔ بہر حال اس پس منظر میں آج اور کل کا دن بہت زیادہ اہم ہیں اور ملک کی قومی سیاست کے ساتھ ساتھ قومی وحدت اور ملکی سالمیت کے مستقبل کا سوال بھی آج اور کل کے فیصلوں سے منسلک ہے، اس لیے کہ پنجاب میں سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیر اعظم کے قتل کی بات بعض حلقوں کی طرف سے بار بار کہی جا رہی ہے اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے کہ اس قتل کی ذمہ داری پنجاب پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات اس تناظر میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے کہ بلوچستان میں پہلے ہی پنجاب کے خلاف سیاسی جذبات کو ابھارنے کا عمل جاری ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ

جنوبی ایشیا کے سیاسی نقشے میں بعض عالمی طاقتوں کی مزعومہ تبدیلی اور پاکستان کو اس کے موجودہ مقام و حیثیت سے (خاکم بدہن) محروم کرنے کے پلان کو دھیرے دھیرے آگے بڑھایا جارہا ہے۔ اور نواب اکبر بگٹی مرحوم کے قتل کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل سے پیدا شدہ صورت حال کو بھی اس کے لیے بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرلی گئی ہے۔

یہ صورتحال ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کے لیے حقیقی معنوں میں لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک جس اندرونی خلفشار کا شکار ہے اور وطن عزیز کے خلاف عالمی سطح پر سازشوں کے جو تانے بانے بنے جارہے ہیں اس سے ملک و قوم کو بحفاظت باہر نکالنے اور اس کے مستقبل کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شکوک و سوالات کو عملاً رد کرکے ایک بہتر مستقبل کی طرف قوم کی راہ نمائی کرنے کی ذمہ داری بہرحال سیاسی اور دینی زعماء پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے انہیں گروہی، علاقائی، طبقاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہوکر سر جوڑنا ہوگا اور ایک ایسی قومی مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا جو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے مقصد قیام اور اس کے دستور و آئین کی بالادستی کی طرف پیش رفت کے ساتھ ساتھ ملکی سالمیت اور قومی وحدت کے لیے بھی ضمانت بن سکے۔ یہ اس وقت ہماری قومی سطح کی دینی و سیاسی قیادت کا کڑا امتحان ہے اور اگر ہمارے راہنما اس وقت بھی اپنے اپنے محدود دائروں کے خول سے نہ نکل سکے اور قومی مفاہمت کے ساتھ ملک و قوم کی قیادت کی ذمہ داری (خدانخواستہ) نہ نبھا سکے تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کے المناک قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے خاندان اور پارٹی کے ساتھ ان کے غم میں شرکت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور وطنِ عزیز کی سالمیت اور مظلوم پاکستانی قوم کی وحدت کی حفاظت فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۷ء)

(۲)

محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ روز ایک خودکش حملہ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا ہے، ہر باشعور شہری اشک بار ہے اور اس کا دل ایک عوامی راہنما کے المناک قتل کے غم کے ساتھ ساتھ ملک اور قومی سیاست کے مستقبل کے حوالہ سے انجانے

خدشات سے دوچار ہوگیا ہے۔

میں کل نماز عصر کے بعد الشریعہ اکادمی سے گھر کی طرف آرہا تھا کہ ایک صاحب راستہ میں ساتھ ہو لیے اور چلتے چلتے سوال کیا کہ مولانا صاحب آپ بھی کہتے ہیں کہ لال مسجد والوں کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا اور امریکہ بھی کہتا ہے کہ وہ دہشت گرد ہیں، دونوں میں فرق کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہم لال مسجد والوں کے مقصد سے نہیں بلکہ طریق کار سے اختلاف کر رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ ان کا طریق کار درست نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ سوات اور وزیرستان والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ملک کے اندر کسی قومی یا دینی مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے کو میں جائز نہیں سمجھتا، وہ کہیں بھی ہو اور کسی عنوان سے بھی ہو ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کا وقت کب آئے گا؟ میں نے کہا کہ جہاد تو ہو رہا ہے، فلسطین میں، عراق میں اور افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ جہاد ہی ہے اور اس جہاد کے لیے میدان جنگ میں خودکش حملہ کو بھی میں بے بس اور مجبور و مظلوم مجاہد کا آخری ہتھیار سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک مسلمان ملک میں اپنی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور بے گناہ اور غیر متعلق لوگوں کی جانیں لینے کو میں جہاد نہیں سمجھتا کیونکہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ ''خروج'' ہے جس کی اسلامی تعلیمات میں اجازت نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ آپ لوگ آخر کب اس خروج کا فتویٰ دیں گے، یہ تو آپ کو دینا ہی ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ خروج کی شرائط ہیں اس کا ایک شرعی طریق کار ہے، اس کے بغیر اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی میں پاکستان میں ہتھیار اٹھانے اور خودکش حملوں کے ذریعہ لوگوں کی جانیں لینے کو جہاد کہنے کے لیے تیار ہوں۔

اس گفتگو کے بعد وہ صاحب اپنی راہ پر ہو لیے جبکہ میں نے نکاح کی ایک تقریب میں جانا تھا ادھر چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر گھر واپس پہنچا، نماز مغرب ادا کی تو فون پر ایک دوست نے یہ اندوہناک خبر سنا دی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کے بعد واپس جاتے ہوئے خودکش حملہ کا نشانہ بن کر جاں بحق ہوگئی ہیں۔ زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور دل کی دھڑکن میں اس سوچ و خیال کے ساتھ ہی اضافہ ہوگیا کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ ردعمل کیسا ہوگا؟ اور قومی سیاست کے مستقبل پر یہ المناک سانحہ کس حد تک اثرانداز ہوگا؟

میری محترمہ بے نظیر بھٹو سے ایک ہی بار ملاقات ہوئی ہے۔ میاں محمد نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کا

دوسرا دور تھا اور نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم حسب معمول حکومت کے خلاف اپوزیشن کو منظم اور متحرک کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ میں اپنے کسی کام سے اسلام آباد گیا تو معلوم ہوا کہ نوابزادہ صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ میری ان سے پرانی نیاز مندی تھی، جس زمانے میں پاکستان قومی اتحاد کی سرگرمیاں عروج پر تھیں میں پنجاب قومی اتحاد کا سیکرٹری جنرل تھا۔ ہمارا صوبائی دفتر نکلسن روڈ پر نوابزادہ صاحب کے دفتر کے ساتھ ہوتا تھا اور اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے میں نے انتخابی اور گروہی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ نوابزادہ صاحب سے ملنے کو جی چاہا تو میں اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر جا پہنچا، وہ زیادہ تر ارشد چودھری کے ہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ بروقت آئے ہیں، میں نے کچھ دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلا رکھا ہے آپ بھی شریک ہو جائیں، گپ شپ رہے گی۔ نوابزادہ صاحب کے کہنے پر میں وہاں رک گیا لیکن یہ سوال نہ کر سکا کہ اس محفل کی نوعیت کیسی ہے؟ بہر حال بہت سے دوست آئے ان میں محترمہ بے نظیر بھٹو بھی تھیں۔ نوابزادہ صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور جونہی انہوں نے میرا نام لیا تو بے نظیر بھٹو فوراً بول اٹھیں ''علماء کونسل والے؟'' میں نے کہا جی ہاں علماء کونسل والا۔ اس پر وہ مسکرائیں اور حال احوال دریافت کرنے لگیں۔

یہ متحدہ علماء کونسل کا بھی ایک خاص پس منظر ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب وہ پہلی بار ملک کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں تو ملک کے دینی حلقوں نے ''خاتون وزیر اعظم'' کے حوالہ سے ان کے خلاف اچھی خاصی تحریک کھڑی کر دی میں بھی اس میں پیش پیش تھا۔ لاہور کے مولانا عبد الرؤف ملک کے ساتھ مل کر ہم نے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام پر مشتمل ''متحدہ علماء کونسل'' قائم کی تھی جس نے مختلف عنوانات پر جدوجہد کی اور خاص طور پر عورت کی حکمرانی کے خلاف اس کی تحریک خاصی معروف ہوئی۔ مولانا مفتی ظفر علی نعمانی، صاحبزادہ حاجی فضل کریم، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا قاضی عبد اللطیف، مولانا عبد المالک خان، پروفیسر محمد یحییٰ اور اس سطح کے سرکردہ علماء کرام اس کا حصہ تھے۔ ہم نے محترمہ کی وزارت عظمیٰ کے خلاف راولپنڈی صدر کے جامعہ اسلامیہ میں ملک بھر کے علماء کرام کا ایک بھرپور اور نمائندہ کنونشن منعقد کیا تھا جس کی صدائے بازگشت کافی دنوں تک قومی سیاست میں سنی جاتی رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو وہ تحریک اور اس میں کام کرنے والے سرکردہ حضرات کے نام یاد تھے اور اسی لیے میرا نام

سنتے ہی انہوں نے پوچھ لیا تھا کہ ''علماء کونسل والے؟''

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ اس کے علاوہ مجھے کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا مگر قومی سیاست میں اور قومی پریس میں ہمیشہ آمنا سامنا رہتا تھا۔ ہم ان کے مخالف کیمپ میں تھے، جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ اور متحدہ علماء کونسل میں سیاسی بیانات کا شعبہ زیادہ تر میرے پاس ہی رہتا تھا اور محترمہ بے نظیر بھٹو اکثر ہمارے بیانات کا ہدف ہوتی تھیں اس لیے سیاسی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ میں خوب لطف آتا تھا۔ ایک دور میں محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو دونوں پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن ہوتی تھیں اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو پی پی پی کی ''کو چیئر پرسن'' (شریک چیئر پرسن) کہا جاتا تھا۔ کراچی کے نشتر پارک میں جمعیۃ علماء اسلام درخواستی گروپ کا جلسہ تھا، میں نے اس میں خطاب کے دوران پھبتی کسی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کے شرعی قانون پر تحفظات کا اظہار کرتی ہیں لیکن انہوں نے اپنی پارٹی میں ایک چیئر پرسن کی جگہ دو چیئر پرسن کی صورت میں اس شرعی ضابطہ کو خود بھی عملاً تسلیم کیا ہوا ہے۔ اس کا قومی پریس میں کئی دن تک چرچا رہا اور پھر بالآخر شریک چیئر پرسن کی صورتحال پس منظر میں چلی گئی۔

اس سب کچھ کے باوجود ایک دانشور سیاستدان کے طور پر ہمیشہ میرے دل میں ان کا احترام رہا، وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، صاحب مطالعہ تھیں، حالات اور مسائل کا دانشورانہ تجزیہ کرتی تھیں، تاریخ اور تاریخ کے عمل پر ان کی نظر تھی اور اپنی سیاست کی راہیں طے کرتے وقت وہ اپنے علم و مطالعہ سے استفادہ بھی کرتی تھیں جس کا ہماری قومی سیاست میں رجحان بہت کم ہے۔ ان کی سیاست اور پالیسیوں سے مجھے بہت کم اتفاق رہا ہے اور اب بھی ان کے سیاسی رخ اور بیانات پر میں شدید تحفظات رکھتا تھا لیکن بہرحال وہ قوم کے ایک بڑے حلقے کی مسلمہ لیڈر تھیں، ایک واضح سوچ، رائے اور پروگرام رکھتی تھیں جس کے لیے وہ پورے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ سرگرم عمل تھیں۔ اور یہ ان کے حوصلہ اور جرأت کا ہی اظہار تھا کہ کراچی کے خوفناک حملہ میں بچ جانے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھیں بلکہ مشن اور پروگرام کو وہ اپنی سیاسی جدوجہد کے لیے ضروری سمجھتی تھیں، اس کے لیے نکل کھڑی ہوئیں اور بالآخر اس پر اپنی جان بھی قربان کر دی۔

میں اس المناک سانحہ پر بھٹو خاندان، پاکستان پیپلز پارٹی اور ملک بھر کے سوگوار عوام کے غم میں

شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۷ء)

(۳)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو ۲۷ دسمبر کو راول پنڈی کے لیاقت باغ میں انتخابی جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد واپس جاتے ہوئے ایک خودکش حملے میں جاں بحق ہوگئی ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ ماہ جب اپنی نو سالہ خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے وطن واپس آئی تھیں تو کراچی میں استقبالیہ جلوس کے دوران بھی ایک خودکش حملہ کا نشانہ بنی تھیں جس میں بہت سے دیگر افراد جاں بحق ہوئے تھے مگر وہ خود محفوظ رہی تھیں، لیکن راول پنڈی کے جلسہ کے بعد ان پر ہونے والا حملہ اس قدر اچانک اور منظم تھا کہ وہ اس سے بچ نہ سکیں اور حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور عوامی لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بیٹی اور جانشین تھیں۔ وہ خود بھی دو مرتبہ وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہی ہیں اور ان کی پارٹی آئندہ انتخابات کے بعد انہیں ایک بار پھر وزیر اعظم بنانے کا عزم ظاہر کر رہی تھی، مگر اسی مہم کے دوران ان کی زندگی کا تسلسل ایک خودکش حملہ آور کے ہاتھوں منقطع ہوگیا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے سیاسی افکار و نظریات، اہداف و مقاصد اور پالیسیوں سے ملک کے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا اور خود ہمیں بھی ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف رہا ہے، لیکن اختلاف کے اظہار کا یہ طریقہ کہ مخالف کی جان لے لی جائے اور اس طرح کے خودکش حملوں کے ذریعے اسے راستے سے ہٹا دیا جائے، نہ صرف یہ کہ سراسر ناجائز اور ظلم ہے بلکہ ملک و قوم کے لیے بھی انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے اور اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔

ہم نے ان صفحات میں بار بار عرض کیا ہے کہ حکومت یا کسی بھی جماعت، طبقہ اور شخصیت کے ساتھ اختلاف کا ہر شہری کو حق حاصل ہے اور اس اختلاف کے اظہار اور اس کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہے، لیکن اس کے لیے طاقت کا استعمال، ہتھیار اٹھانا اور کسی کی جان کے درپے ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے، نہ اسلامی تعلیمات اس کی اجازت دیتی ہیں اور نہ ہی آج کا معروف جمہوری کلچر اس کا متحمل اور روادار ہے۔ اس لیے ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کا اس الم ناک

قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے خاندان، پارٹی اور دیگر متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دیں اور تمام متعلقین و پس ماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت اس سلسلے میں اپنی قانونی واخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرے گی اور اس قسم کی افسوس ناک وارداتوں کی روک تھام کے لیے موثر اقدامات کرے گی۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۸ء)

کرنل امیر سلطان تارڑ شہید

کرنل امام کی شہادت اور حضرت سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر خودکش حملہ بظاہر دو الگ الگ واقعات ہیں جن میں کوئی جوڑ اور تعلق دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتا لیکن حالات میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے پس منظر پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کراچی میں ہونے والے خودکش حملے سمیت ان تینوں واقعات کے پس منظر کو ایک دوسرے سے الگ کرنا آسان نہیں۔

کرنل امام نے، جن کا اصل نام کرنل امیر سلطان تارڑ تھا، جہادِ افغانستان میں مجاہدین کو ٹریننگ دینے اور جنگی حکمت عملی سکھانے میں اہم کردار ادا کیا اور افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ لڑنے والے مجاہدین کم و بیش سب کے سب ان کی خدمات، قربانیوں اور جدوجہد کے معترف چلے آرہے ہیں۔ سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی کے بعد جب مجاہدین کے مختلف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کی مکروہ سازش کا تانا بانا بنا گیا تو اس خلفشار سے تنگ آکر طالبان کی شکل میں سامنے آنے والے مجاہدین کو منظم کرنے میں بھی کرنل امام شہید متحرک رہے۔ اس پس منظر کے باعث کرنل امام کو سنجیدہ حلقوں میں اس نظر سے دیکھا جا رہا تھا کہ جب اس خطے میں استعماری قوتوں کی واپسی کے لیے کسی محفوظ راستے کی تلاش ہوگی تو جو لوگ خطے میں امن کی واپسی کے لیے اہم رول ادا کر سکیں گے ان میں کرنل امام سرفہرست ہوں گے۔ وہ افغان قوم کے مزاج و نفسیات سے بھی واقف تھے اور پاکستان کی ضروریات و مفادات کو بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس خطے میں بیرونی قوتوں کی دراندازی،

بالخصوص بھارت کے مسلسل کردار پر بھی ان کی نظر تھی اور پاکستان اور افغانستان دونوں ملکوں کے ذمہ دار حلقوں میں انہیں قابل اعتماد تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے ان انتہا پسند قوتوں اور عالمی سازشوں کے منصوبہ کاروں کے لیے، جو مصالحت و مفاہمت کا ہر راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں اور جنہیں اعتدال و توازن کی بات کرنے والے اور امن کی واپسی کے لیے کام کرنے والے ایک آنکھ نہیں بھاتے، کرنل امام اپنی تمام تر جہادی خدمات کے باوجود ان کی انتہا پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

میرے نزدیک کرنل امامؒ کی شہادت مولانا محمد حسن جان شہیدؒ، حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ آف وانا، اور ڈاکٹر محمد فاروق شہیدؒ کی شہادت کا تسلسل ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو درمیان کے آدمی سمجھے جاتے تھے اور جن سے نہ صرف امن کی واپسی کے لیے مؤثر کردار کی توقع تھی بلکہ یہ لوگ جمہور علماء اسلام کی تعبیر اور طریق کار کے مطابق نفاذِ شریعت کے لیے بھی مخلص تھے اور عملاً کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کرنل امام شہیدؒ نے بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جام شہادت نوش کیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کرنل امام کو اغوا کرنے والوں نے تاوان نہ ملنے پر شہید کیا ہے یا وہ دورانِ حراست حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے ہیں، شہید تو وہ دونوں صورتوں میں ہیں۔ اور مجھے جنرل (ر) حمید گل کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کرنل امام ''شہیدِ پاکستان'' ہیں، جبکہ ان کے بقول ان کی شہادت کے پیچھے اصل ہاتھ بھارت کا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ہم سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد اس خطے کے مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا جس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔ یہی بات اگر بین الاقوامی تناظر سے ذرا نیچے اتر کر قومی سطح پر دیکھ لی جائے تو صورتحال کچھ مختلف نہیں۔ راقم الحروف کئی بار یہ بات مختلف فورموں اور مختلف کالموں میں عرض کر چکا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل سندھ میں ''حروں'' کی سرگرمیاں اسی نوعیت کی تھیں، وہ برطانوی تسلط کے خلاف مسلح کارروائیوں میں مصروف تھے اور اگر آج کی اصطلاح استعمال کی جائے تو ''دہشت گرد'' جبکہ ہماری قومی تاریخ کے مطابق وہ مجاہدینِ آزادی تھے اور ہر محب وطن انہیں مجاہدینِ آزادی کے طور پر ہی خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جنہیں قیام پاکستان کے بعد ''پاک فوج'' میں ایڈجسٹ کر لیا گیا تھا۔ مگر افغانستان میں سوویت یونین کی واپسی کے بعد پاکستان سے تعلق رکھنے والے ہزاروں مجاہدین کے بارے میں یہ حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی۔ انہیں حکومت پاکستان نے بھی تنہا

چھوڑ دیا، پاک فوج نے بھی انہیں کسی عسکری حکمت عملی کا حصہ بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور پاکستان کی وہ دینی جماعتیں جو انہی مجاہدین کے ذریعے جہادِ افغانستان میں پیش پیش نظر آتی تھیں انہوں نے بھی انہیں نظر انداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے ہر گروہ اپنا مستقبل، اپنا ٹارگٹ اور اپنا طریق کار طے کرنے میں آزاد ہو گیا۔ اس سے عالمی قوتوں اور بیرونی مداخلت کاروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور جس طرح ہیلری کلنٹن کے بقول عالمی قوتیں اپنی سطح پر اس کا خمیازہ بھگت رہی ہیں اسی طرح قومی سطح پر ہم سب اس قومی غفلت کے تلخ نتائج کا سامنا کر رہے ہیں۔

آج کی صورتحال اسی قومی اور مجرمانہ غفلت کا منطقی نتیجہ ہے اور اس مخمصے سے نکلنے کے لیے سوچا جانے والا کوئی بھی حل اس پس منظر کو نظر انداز کر کے کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ہم ان گروپوں کے ماضی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی شدت پسندی کے اسباب کو دور کرنے سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہم انہیں بین الاقوامی سازشوں کے جال سے نکالنے میں سنجیدہ نہیں ہیں، اور انہیں ہر حالت میں "دشمن" قرار دے کر دشمنوں ہی کے حوالے کیے رکھنے کا ہم نے تہیہ کر لیا ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ تلخ نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ حالات میں تبدیلی محض خواہشات اور اپیلوں یا فتوؤں سے نہیں آیا کرتی، اس کے لیے عملاً کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں "کچھ کرنے" کے ناگزیر تقاضوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

بات ذرا دور نکل گئی ہے لیکن غیر متعلقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ کرنل امامؒ کی شہادت کو اس پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسی صورتحال میں اصلاح، توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے پر اس رویے کو پسند نہ کرنے والوں کی انتہا پسندی کا شکار ہوئے ہیں۔ دوسری طرف داتا گنج بخشؒ کے عرس کے موقع پر خودکش حملے کے المناک واقعہ کو دیکھ لیجئے۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کے مزار پر اس سے قبل بھی خودکش حملہ کئی بے گناہ لوگوں کی جان لے چکا ہے اور اب اگرچہ پولیس کی مستعدی اور حفاظتی نظام کے باعث دربار کے اندر تک خودکش حملہ آور کی رسائی نہیں ہو سکی مگر وہ اپنے مقصد میں بہرحال کامیاب ہوا ہے کہ اس نے حضرت سید علی ہجویریؒ کے عرس کے زائرین کو نشانہ بنایا ہے اور بہت سے لوگوں کی قیمتی جانیں لے لی ہیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ اور حضرت سید عبد اللہ شاہ غازیؒ کے مزارات پر ہونے والے خودکش حملوں کے بعد اسے فرقہ وارانہ رنگ دے کر ملک میں بریلوی

دیوبندی کشمکش کو ہوا دینے کی جو مہم چلائی گئی تھی اس کا غبار ابھی زمین پر نہیں بیٹھنے پایا تھا کہ لاہور اور کراچی کے ان تازہ دھماکوں نے ملک بھر کے عوام کو دل گرفتہ کر دیا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء)

اسامہ بن لادن شہید

(۱)

الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ کا نام پہلی بار افغانستان کی پہاڑیوں میں جہادِ افغانستان کے دوران سنا جب افغانستان میں روسی افواج کی آمد اور سوشلسٹ نظریات کے تسلط کے خلاف افغانستان کے مختلف حصوں میں علماء کرام اور مجاہدینِ آزادی نے علمِ جہاد بلند کیا اور افغانستان کی آزادی کی بحالی اور اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے میدانِ کارزار میں سرگرم ہوگئے۔ ابتداء میں یہ مجاہدین کسمپرسی کے عالم میں لڑتے رہے حتیٰ کہ پرانی بندوقوں اور بوسیدہ ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ بوتلوں میں صابن اور پٹرول بھر کر ان دستی بموں کے ساتھ روسی ٹینکوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ دنیا انہیں دیکھ کر مجنون سمجھتی رہی، چٹان کے ساتھ سر ٹکرانے اور خودکشی کرنے کے طعنے دیتی رہی مگر ان خدامست لوگوں نے کسی طعنے اور الزام کی پراوا کیے بغیر سر ٹکرانے کا یہ عمل جاری رکھا۔ مجھے وہ دور اچھی طرح یاد ہے جب شیرانوالہ لاہور کے ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا حمید الرحمان عباسیؒ شب و روز محنت کر کے آٹا، چینی اور دیگر ضروریات جمع کرتے اور جب ٹرک کے برابر سامان ہو جاتا تو اسے افغانستان پہنچانے کا بندوبست کرتے۔

پھر جب دنیا کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ چٹان سے سر ٹکرانے والے آسانی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور چٹان کے اپنی جگہ سے سرکنے کا امکان پیدا ہوتا جا رہا ہے تو پوری دنیا اس طرف متوجہ ہوگئی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو سرد جنگ میں سوویت یونین کو شکست دینے کے خواہاں تھے، وہ لوگ بھی تھے جو گرم پانیوں اور خلیج عرب تک سوویت یونین کی رسائی کو روکنا چاہتے تھے، اور وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں تھے جنہوں نے قرآن و حدیث میں جہاد کی اہمیت و فضیلت کا سبق پڑھ رکھا تھا اور تاریخ میں مجاہدین کے کارنامے پڑھ پڑھ کر ان کے دل جہاد میں حصہ لینے کے لیے مچلتے تھے مگر کوئی عملی میدان

دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان بین الاقوامی کشمکش کا بہت بڑا میدان بن گیا اور مختلف ملکوں اور طبقات کے لوگ جہاد کے اس عمل میں مشغول پائے جانے لگے۔ افغان مجاہدین کی مختلف جماعتیں وجود میں آئیں، ان کے اتحاد تشکیل پائے، بیرونی قوتوں سے ان کے رابطے ہوئے، ہتھیاروں اور رقوم کی ریل پیل ہوئی اور افغانستان مجاہدین کی بھرتی اور ٹریننگ کا عالمی مرکز بن گیا۔

اس دوران میرا بھی افغانستان آنا جانا رہتا تھا، بہت سے مورچوں میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ لڑنا تو میں سرے سے نہیں جانتا اور نہ ہی کسی ہتھیار کی ٹریننگ حاصل کر سکا۔ ایک بار کسی انٹرویو میں مجھ سے سوال ہوا کہ کیا آپ ہتھیار چلانا جانتے ہیں؟ میں نے قلم ہاتھ میں پکڑ کر کہا کہ یہ میرا ہتھیار ہے اور اس کو چلانا بحمد اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرا مورچوں میں جانا دو مقاصد کے لیے ہوتا تھا۔ ایک یہ کہ اس سے مجاہدین کی حوصلہ افزائی ہوتی اور دوسرا اس لیے کہ وہاں سے تازہ معلومات حاصل کر کے قلم کے ذریعے اپنے قارئین کو ان سے آگاہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں جمعیۃ علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کا چیف ایڈیٹر تھا اور ایسے مقامات پر آنے جانے کے لیے میرا بڑا ٹائٹل یہی ہوا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً کسی مورچے میں جاتا، ایک دو دن رہتا اور واپسی پر اپنے مضامین کے ذریعے تاثرات و معلومات قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اس دور میں میرے بیسیوں مضامین ہفت روزہ ترجمانِ اسلام اور ملک کے دیگر اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔

جہادِ افغانستان میں عرب ممالک سے ہزاروں نوجوان شریک ہوئے، ان کے اپنے کیمپ تھے، ان میں بھی جانے کا موقع ملتا تھا۔ اس دوران وہیں سنا کہ سعودی عرب کے ایک انتہائی متمول اور مقتدر خاندان کا ایک نوجوان جہاد میں عملاً شریک ہے اور جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے دونوں محاذوں پر دادِ شجاعت دے رہا ہے۔ اس نوجوان کا نام اسامہ بن لادن ہے اور وہ شہزادگی کی زندگی ترک کر کے خاکساری کے ذوق کے ساتھ شب و روز کے اعمال میں مصروف ہے۔ یہ یاد نہیں کہ اس دوران اسے دیکھا یا نہیں لیکن اس کی شجاعت اور سخاوت کے واقعات مسلسل سننے میں آتے رہے تا آنکہ عالمی میڈیا نے بھی اسے ایک عظیم مجاہد اور فریڈم فائٹر کے انداز میں جہادِ افغانستان کے ہیرو کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

افغانستان سے سوویت یونین کی افواج کی واپسی، جہادِ افغانستان کے اس دور کا اختتام، سوویت

یونین کے بکھرنے کا تاریخی عمل، اور جہادِ افغانستان کے منطقی نتیجے کو سبوتاژ کرنے کی سازشیں ایک مستقل موضوع بحث ہیں جس کا صرف ایک پہلو یہ ہے کہ افغان مجاہدین اور ان کے ساتھ جہاد میں شریک دنیا بھر کے مجاہدین کے بارے میں عالمی پراپیگنڈے کا رخ اس طرح موڑ دیا گیا کہ انہوں نے دراصل امریکہ کی جنگ لڑی ہے اور سرد جنگ میں سوویت یونین کو شکست دینے میں امریکہ کے ہاتھوں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی دور کی بات ہے ابھی افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کی تشکیل کے مختلف فارمولے آزمائے جارہے تھے اور طالبان اور القاعدہ کا دور دور تک کوئی وجود بلکہ آثار تک نہیں تھے، اسلام آباد میں بائیں بازو کے چند دانشوروں کے ساتھ ایک مجلس میں میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ افغان مجاہدین کو امریکہ نے تیار کیا تھا، اس نے انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر کے چھوڑ دیا ہے اور افغان مجاہدین نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ جبکہ میرا موقف یہ تھا کہ جہادِ افغانستان کا آغاز افغان علماء اور مجاہدین نے اپنے ملک کی خود مختاری اور نظریاتی تشخص کے لیے کیا تھا اور کم و بیش تین برس تک وہ دیسی ہتھیاروں کے ساتھ فاقہ مستی کے عالم میں لڑتے رہے۔ جبکہ امریکہ اپنا مفاد دیکھ کر اس میں شریک ہوا اور پھر ساری دنیا اس طرف متوجہ ہوئی۔ اس لیے اس جنگ میں مجاہدین کے اہداف مختلف تھے اور امریکہ کے اہداف الگ تھے۔ ان کے درمیان اشتراکِ عمل تو ہوا جس میں امریکی کیمپ نے اپنا ہاتھ دکھا دیا کہ اپنے مقاصد حاصل کر لیے مگر مجاہدین کے مقاصد و اہداف کو سبوتاژ کرنے میں مصروف ہے۔

جب گفتگو کچھ آگے بڑھی تو میں نے ان دوستوں سے کہا کہ اس کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیں۔ اگر مستقبل کے پروگرام میں یہ مجاہدین امریکی ایجنڈے کا حصہ بن گئے تو میں تسلیم کر لوں گا کہ انہوں نے امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر آنے والے دور کا نقشہ اس سے مختلف ہوا اور مجاہدین نے امریکی ایجنڈے میں فٹ ہونے سے انکار کر دیا تو آپ دوستوں کو میری بات ماننا ہوگی کہ اس جنگ میں مجاہدین کے اپنے اہداف و مقاصد تھے اور وہ امریکہ کی جنگ لڑنے کی بجائے اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ البتہ جنگ کی ترجیحات کے تعین میں وہ امریکہ سے بازی ابھی تک نہیں جیت پائے کہ امریکہ نے اپنی طاقت، لابنگ، ڈپلومیسی اور میڈیا کے ذریعے انہیں سردست کارنر کر دیا ہے۔

اس کے بعد القاعدہ سامنے آئی اور طالبان کا دور دنیا نے دیکھا۔ وہی مجاہدین جو سوویت یونین کے

خلاف جہاد میں بظاہر امریکہ کے شانہ بشانہ تھے اب امریکہ کے سامنے کھڑے تھے اور تمام تر جاہ و جلال اور شان و شوکت کے باوجود امریکہ کا سانس پھولتا سب کو دکھائی دے رہا تھا۔ الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ جن دنوں جلال آباد افغانستان میں مقیم تھے میری ان سے ملاقات ہوئی، میں نے ایک رات ان کے کیمپ میں گزاری، ان سے انٹرویو لیا جو قومی اخبارات میں انہی دنوں شائع ہوا۔ خفیہ ادارے کافی عرصہ تک میرا پیچھا کرتے رہے کہ آپ وہاں تک کیسے پہنچے؟ مگر میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میں جرنلسٹ ہوں میرے اس سفر کی ساری رپورٹ اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اور میں نے کوئی خفیہ کام نہیں کیا۔ البتہ اپنے سفر کے ذرائع بتانے کا پابند نہیں ہوں اور نہ ہی بتاؤں گا۔

اس دوران جب ''القاعدہ'' تشکیل پائی تو مجھ سے بھی رابطہ کیا گیا مگر میرے کچھ تحفظات تھے۔ میں جہادِ افغانستان کے منطقی نتائج کی تکمیل اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام و استحکام سے پہلے عالم اسلام میں کسی بھی اور جنگ کو ''قبل از وقت'' سمجھتا تھا اور اپنی اس رائے پر اب بھی قائم و مطمئن ہوں۔ اس لیے میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی البتہ دنیا کے کسی بھی حصے میں جو مجاہدین خلوص کے ساتھ دین کی سربلندی اور اپنے اپنے ملک کی آزادی و خود مختاری کے لیے میدانِ عمل میں ہیں، میری دعائیں اور نیک تمنائیں ہمیشہ ان کے ساتھ رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

الشیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ عالمِ اسلام بالخصوص عالمِ عرب میں عالمی استعمار کے استعماری ایجنڈے کے خلاف مزاحمت کی علامت تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اس کے لیے پوری قوت کے ساتھ جنگ لڑی۔ ان کے طریق کار اور ترجیحات سے اختلاف ہو سکتا ہے جو ظاہر ہے کہ مجھے بھی تھا لیکن ان کے خلوص، ایثار، جدوجہد حبِ دینی، استقامت، عزم و حوصلے اور مسلسل قربانیوں سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس پر وہ ہر نیک دل مسلمان کے سلامِ محبت و عقیدت کے حقدار ہیں۔ جہاد کے اس مقدس عمل میں کون کون لوگ کہاں کہاں سے شریک ہوئے، ان کی قربانیوں اور جہد و ایثار کو دیکھیں تو بلاشبہ یہ اس دور میں اسلام کے اعجاز اور جہاد کی کشش کا خوبصورت اظہار ہے۔ میں اس نوجوان کو کبھی نہیں بھول سکتا جو ایک بار مجھے افغانستان کے ایک مورچے سے واپس پاکستان چھوڑنے آرہا تھا۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، عمر زیادہ سے زیادہ سولہ سترسال ہوگی، میں نے پوچھا کہاں کے رہنے والے ہو؟ بتایا کہ مدینہ منورہ کا باشندہ ہوں۔ دریافت کیا کہ کب سے یہاں ہو؟ جواب دیا کہ دو سال سے ہوں۔ پوچھا کہ

کب واپسی کا ارادہ ہے؟ کہا کہ جہاد میں کامیابی کے بعد ہی واپس جاؤں گا یا یہیں شہید ہو جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ مدینہ منورہ چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ جہاد یہاں ہو رہا ہے، اس کے بعد مجھے اس سے کوئی اور سوال کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

یہ نوجوان اسامہ بن لادن نہیں تھا لیکن اپنے جذبے اور قربانی کے حوالے سے وہ بھی ایک اسامہ ہی تھا، اس جیسے اسامہ بن لادن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین کی صفوں میں موجود ہیں۔ اس لیے اسامہ شہید تو ہوا لیکن مرا نہیں، کیونکہ وہ اب گوشت پوست کے کسی انسان کا نام نہیں رہا بلکہ حریت، جہاد اور استقامت کی علامت بن چکا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اسے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور خلوص وایثار کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو ہر جگہ کامیابی سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ مئی ۲۰۱۱ء)

(۲)

اسامہ بن لادن کا نام سب سے پہلے جہاد افغانستان کے دوران خوست میں سنا تھا جہاں یاور کے مقام پر مجاہدین کی عسکری تربیت گاہ تھی۔ دنیا کے مختلف ممالک سے نوجوان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر وہاں آتے اور چند دن ٹریننگ حاصل کر کے افغان مجاہدین کے ہمراہ روسی استعمار کے خلاف برسرپیکار ہو جاتے۔ راقم الحروف کو متعدّد بار حرکت الانصار کی ہائی کمان کی فرمائش پر ایسی تربیت گاہوں میں جانے کا موقع ملا۔ میرے جیسے لوگ وہاں جا کر عملاً تو کچھ نہیں کر پاتے مگر مجاہدین کا خیال تھا کہ ہمارے جانے سے ان کو حوصلہ ملتا ہے، خوشی ہوتی ہے۔ اور خود ہمیں حالات کا براہ راست مشاہدہ کر کے لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کا موقع ملتا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ ہم وقتاً فوقتاً وہاں جاتے اور ایک دو روز مجاہدین کے ساتھ تربیت گاہوں اور مورچوں میں گزار کر واپس آ جاتے۔ وہیں ایک تربیت گاہ عرب نوجوانوں کے لیے مخصوص تھی جہاں مختلف عرب ممالک سے آئے ہوئے سینکڑوں نوجوان تربیت حاصل کرتے تھے، مختلف عرب نوجوانوں سے ملاقات ہوتی تھی اور عالم اسلام کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

ایک موقع پر یاور سے میران شاہ تک واپس پہنچانے کے لیے جو گاڑی بھجوائی گئی اس کا ڈرائیور ایک عرب نوجوان تھا جس کی عمر بمشکل اٹھارہ برس ہوگی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ مدینہ منورہ کا رہنے والا ہے اور دو سال سے جہاد میں مصروف ہے۔ وطن واپسی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ

جہاد میں کامیابی کے بعد ہی وطن واپس جانے کا ارادہ ہے۔ یہ دور وہ تھا جب ابھی خوست فتح نہیں ہوا تھا۔ وہاں اسامہ بن لادن کا نام سنا اور یوں یاد پڑتا ہے کہ شاید کسی موقع پر انہیں دیکھا بھی ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ سعودی عرب کے متمول ترین تاجر خاندان "بن لادن فیملی" کا ایک نوجوان جس کا نام اسامہ ہے، خود بھی جہاد میں عملاً شریک ہے اور زیادہ تر اگلے مورچوں میں رہتا ہے اور مجاہدین کے مختلف گروپوں کی دل کھول کر مالی امداد بھی کرتا ہے۔ بلکہ بعض دوستوں نے بتایا کہ جہاد افغانستان میں مالی تعاون اور مجاہدین کی کفالت میں شاید ہی کوئی دوسرا عرب شیخ اس نوجوان کی ہمسری کا دعوی کر سکے۔ اسامہ بن لادن کا نام اس کے بعد مختلف حوالوں سے وقتاً فوقتاً سننے میں آتا رہا۔

پھر معلوم ہوا کہ جہاد افغانستان میں تربیت حاصل کرنے والے اور جہاد میں عملاً شرکت کرنے والے عرب نوجوان اپنے اپنے ملکوں کی حکومتوں کے ہاں معتوب قرار پا چکے ہیں۔ ان حکومتوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ جہاد کے جذبہ سے سرشار اور ٹریننگ سے بہرہ ور یہ نوجوان اپنے ملکوں میں جذبۂ جہاد کے فروغ کا باعث بنیں گے اور ان ممالک میں مغربی استعمار کے مسلط کردہ نوآبادیاتی نظاموں کے لیے چیلنج ثابت ہوں گے۔ اس لیے انہیں "دہشت گرد" قرار دینے کا فیصلہ ہوا اور ان سے نمٹنے کے لیے مسلم ممالک کے وزراء داخلہ اور وزراء خارجہ کے مسلسل اجلاس ہونے لگے۔ پاکستان میں ان "دہشت گردوں" کے خلاف مہم کا آغاز ہوا اور انہیں پاکستان سے نکالنے کے لیے منظم منصوبہ بندی کی گئی۔ اس دوران "اسامہ بن لادن" کا نام ایک بار پھر سامنے آیا اور پتہ چلا کہ یہ نوجوان سوڈان میں بیٹھا ہے اور نہ صرف سوڈان کی نظریاتی اسلامی حکومت کو اقتصادی سپورٹ مہیا کر رہا ہے بلکہ ان عرب نوجوانوں کی پناہ گاہ بھی ہے جو روسی استعمار کے خلاف تاریخی جہاد میں حصہ لینے کی پاداش میں اپنے ممالک کی حکومتوں کے ہاں "دہشت گرد" اور "مفرور" قرار پا چکے ہیں۔ سوڈان رقبہ کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے اور ہمیشہ قحط سالی کا شکار رہا ہے۔ لیکن چند برسوں سے ڈاکٹر حسن ترابی اور جنرل عمر بشیر کی قیادت سے معاشی خود کفالت اور اسلامی اصلاحات کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ سوڈانیوں نے اس راز کو پا لیا کہ اسلامی نظام کے حقیقی نفاذ کے لیے اس سے قبل معاشی خود کفالت ضروری ہے ورنہ مغربی ملکوں اور عالمی اداروں کی معاشی امداد کا شکنجہ دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ چنانچہ انہوں نے "ناکل مما نزرع ونلبس مما

نصنع" (اپنا بویا ہوا کھائیں گے اور اپنا بنایا ہوا کپڑا پہنیں گے) کا قومی نعرہ لگایا اور مغرب کے آگے پھیلنے والے ہاتھ سمیٹ لیے۔ سوڈانیوں نے زراعت کو فروغ دیا، ملک کے اندر سڑکیں تعمیر کیں اور محنت کا راستہ اختیار کیا جس کا ثمرہ بارگاہ ایزدی سے یہ ملا کہ سوڈان گندم میں خود کفیل ہوگیا ہے بلکہ اب برآمد کرنے کی پوزیشن میں ہے جس پر مغرب کے پیچ و تاب کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے صدر حسنی مبارک پر کسی دور میں ہونے والے قاتلانہ حملہ کے ملزموں کو پناہ دینے کے الزام میں سوڈان کو دہشت گرد ملک قرار دیا جا چکا ہے اور امریکہ بہادر سوڈان سے نمٹنے کے لیے تیاریاں کر رہا ہے۔ جبکہ سوڈان کے جنوب میں عیسائی اقلیت کو ابھار کر اور اسے مالی و عسکری سپورٹ مہیا کر کے سوڈان کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے اور تقسیم کر دینے کے مذموم منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سوڈان کی اس معاشی خود کفالت اور نظریاتی پیش رفت کے پیچھے "اسامہ بن لادن" کا ہاتھ ہے اور اسامہ بن لادن نے سوڈان میں بیٹھ کر نہ صرف وہاں کی اسلامی حکومت کا حوصلہ بڑھایا بلکہ قومی شاہراہ کی تعمیر میں ہاتھ بٹھا کر سوڈان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اسامہ بن لادن کا یہ "جرم" ناقابل معافی تھا کہ اس نے ایک غریب مسلمان ملک کو معاشی خود کفالت کا راستہ دکھایا، اسلامی نظام کے نفاذ کی مستحکم بنیاد فراہم کی اور عالمی مالیاتی اداروں کو ایک "شکار گاہ" سے محروم کر دیا۔ چنانچہ امریکہ بہادر نے گزشتہ سال عالمی دہشت گردوں کی جو فہرست جاری کی، اس میں "اسامہ بن لادن" کا نام سرفہرست ہے۔ سوڈان کو دھمکی دی گئی کہ وہ "اسامہ" کو امریکہ کے حوالے کر دے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اسامہ بن لادن نے سوڈان کو مشکلات سے نکالنے میں مدد دی تھی اس لیے اس کی مشکلات میں اضافے کا باعث بننا اس غیور عرب نوجوان کی حمیت و غیرت کے خلاف تھا۔ اس لیے اسامہ بن لادن نے چپکے سے سوڈان کو خیر باد کہا اور افغانستان کی آزاد سرزمین میں نیا مسکن بنالیا۔ اسامہ بن لادن کا اپنا وطن سعودی عرب ہے جہاں اس کا خاندان آج بھی ملک کا متمول ترین تجارتی خاندان ہے، جہاں اس کے اہل خاندان ملک کی معاشی ترقی کا ایک اہم کردار ہیں لیکن اسامہ پر سعودی عرب کے دروازے بند ہیں۔ اس لیے کہ وہ خلیج عرب میں امریکی افواج کی مسلسل موجودگی کا مخالف ہے اور اسے عرب ممالک کی خود مختاری کے منافی اور اسرائیل کی تقویت کا باعث سمجھتا ہے۔ وہ سعودی عرب میں اسلامی

اصلاحات کا داعی ہے اور ملک کے نظام کو مکمل طور پر اسلامی تعلیمات واحکام کے سانچے میں ڈھالنے کی بات کرتا ہے۔ وہ شاہی خاندان کی پر تعیش زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور خلافت اسلامیہ کا احیاء چاہتا ہے اور یہ "جرم" آج کے دور میں اتنا ہلکا نہیں کہ اسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے۔

راقم الحروف کو گزشتہ ماہ کے اواخر میں افغانستان جانے کا اتفاق ہوا تو جی چاہا کہ ممکن ہو تو "اسامہ بن لادن" سے بھی ملاقات کر لی جائے اور اس کا مسکن دیکھ لیا جائے۔ کچھ دوستوں سے بات کی تو حالات نے موافقت کا رخ اختیار کر لیا اور ایک شب ہم کچھ دوست چپکے سے "اسامہ بن لادن" کے کیمپ میں جا پہنچے۔ چند نو تعمیر شدہ کچے مکانوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی "الشیخ اسامہ بن لادن" کی پناہ گاہ ہے جہاں ان کے ساتھ انہی کی طرح کے بہت سے عرب نوجوان قیام پذیر ہیں۔ ایک رات ہم وہاں رہے۔ الشیخ اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی، دبلے لمبے قد کا ایک نوجوان، افغانی لباس پہنے ہوئے، سر پر پگڑی باندھے، کندھے سے کلاشنکوف لٹکائے اور ہاتھ میں چھوٹی سی تسبیح گھماتے ہوئے سامنے آیا تو یوں محسوس ہوا کہ کوئی افغان عالم دین کسی دینی مدرسہ میں سبق پڑھا کر درسگاہ سے باہر نکل رہا ہے۔ اسامہ بن لادن کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ ہیں جو اسی خیمہ بستی میں قیام پذیر ہیں بلکہ دستر خوان پر سادہ کپڑوں میں ملبوس تیرہ سال کا ایک بچہ ہمارے ہاتھ دھلاتے ہوئے آگے بڑھا تو میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دوست نے بتایا کہ شیخ اسامہ کا بیٹا ہے۔ جی چاہا کہ اس بچے کے ہاتھ سے پانی کا برتن لے لوں اور خود اس کے پاؤں دھلاؤں جو سعودی عرب میں اپنے خاندان کے بلند وبالا محلات کے بجائے افغانستان کے ایک کیمپ میں اپنے پر عزم اور مجاہد باپ کے ساتھ صرف اس لیے صعوبتیں برداشت کر رہا ہے کہ وہ اسلام کی سربلندی اور نفاذ کا خواہاں ہے اور اس بارے میں کسی مصلحت اور لچک کا روادار نہیں ہے۔

سچی بات ہے کہ اسامہ بن لادن کا کیمپ دیکھ کر مجھے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو بصیرؓ کا وہ کیمپ یاد آگیا جو انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مظلوم مسلمانوں کو کافروں کے مظالم سے بچانے کے لیے پناہ گاہ کے طور پر بنایا تھا۔ ابو بصیرؓ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو کر مدینہ پہنچے تو جناب رسول اللہؐ معاہدہ کی رو سے انہیں واپس کفار کے پاس بھجوانے کے پابند تھے۔ چنانچہ آپؐ نے معاہدے پر عمل کر کے انہیں واپس کر دیا۔ مگر ابو بصیرؓ نے مکہ مکرمہ واپس جانے کے بجائے راستہ میں

سمندر کے کنارے ایک کیمپ بنالیا جو دیکھتے دیکھتے کفار کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی محفوظ پناہ گاہ بن گیا اور بالآخر کفار کو خود معاہدہ کی اس شق سے دستبردار ہونا پڑا۔ خدا کرے کہ آج کا یہ ابوبصیرؓ بھی مسلمان مجاہدین کو محفوظ پناہ گاہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو اور اس کی یہ جدوجہد دنیا میں اسلام کے غلبہ ونفاذ کا نقطۂ آغاز بن جائے، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۳ مارچ ۱۹۹۷ء)

پیر پگارا سید مردان علی شاہ مرحوم

پیر آف پگارا سید مردان علی شاہ گزشتہ دنوں لندن میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ پاکستان کی قومی سیاست کا ایک اہم کردار تھے اور ان کا خاندان برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش میں برطانوی استعمار کے خلاف قومی جدوجہد اور تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری اہم خانقاہوں دین پور شریف، امروٹ شریف، ہالیجی شریف اور شیرانوالہ لاہور کا تعلق سلسلہ قادریہ سے ہے۔ اور ان کے روحانی شجرے پر نظر ڈالیں تو ایک بڑا نام حضرت شاہ محمد راشدؒ کا ملتا ہے جن کی نسبت سے یہ روحانی سلسلے خود کو ''راشدیہ'' کے عنوان سے موسوم کرتے ہیں۔ خود میرے نام کے ساتھ ''راشدی'' کی نسبت بھی اسی حوالے سے ہے کہ میرا بیعت کا تعلق شیرانوالہ لاہور میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ سے تھا۔ میں نے جب حصول تعلیم شروع کیا تو اپنے آبائی قصبہ گکھڑ کے حوالے سے زاہد گکھڑوی کے نام سے لکھتا تھا۔ حضرت الشیخ مولانا عبید اللہ انورؒ کے ارشاد پر کہ گکھڑوی تلفظ کے لحاظ سے ایک ثقیل لفظ ہے، اس لیے اپنی نسبت سلسلہ کی طرف کر دیں، میں نے ''زاہد الراشدی'' کے نام سے لکھنا شروع کر دیا اور اسی تعارف سے موسوم چلا آرہا ہوں۔

شاہ محمد راشد رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانشینی اور حلقہ ارادت اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کر کے ایک کو اپنی پگڑی جبکہ دوسرے کو جھنڈا عطا فرما دیا تھا جس کی وجہ سے سندھ میں پیر صاحب آف پگارا اور پیر صاحب آف جھنڈا کے نام سے دو گدیاں اب تک چلی آرہی ہیں اور ان دونوں گدیوں کی اپنی اپنی مستقل تاریخ ہے۔

سندھ میں ''حروں'' کے نام سے برطانوی استعمار کے خلاف جو مسلح تحریک ایک عرصہ تک سرگرم

رہی اس کے بانی پیر پگارا ششم حضرت پیر سید صبغۃ اللہ شہیدؒ تھے جو گزشتہ روز وفات پانے والے پیر صاحب آف پگارا کے والد محترم تھے۔ اور شہدائے بالاکوٹ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جب پشاور کے صوبے پر حملے کے لیے سندھ کے راستے گزرے تو پیر صاحب آف پگارا کی پہلی گدی ان کا مرکز تھی۔ اس وقت کے پیران پگارا نے نہ صرف ان کی خوب آؤ بھگت کی بلکہ ان کے جہاد آزادی میں ہر ممکن تعاون بھی کیا۔ بعد میں یہی جذبۂ حریت حروں کی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ سندھ میں حروں نے ایک عرصے تک چھاپہ مار کاروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ امروٹ شریف کے حضرت مولانا تاج محمود امروٹی، جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تحریک کے اہم راہ نما تھے، حروں کی اس مسلح تحریک آزادی کے پشت پناہ اور معاون رہے۔

پیر پگارا ششم حضرت پیر سید صبغۃ اللہ شاہ راشدیؒ کو انہی چھاپہ مار کاروائیوں کی وجہ سے برطانوی حکومت نے گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا اور اسی جرم میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ ان کے دو بیٹوں سید سکندر علی شاہ المعروف علی مردان شاہ اور سید نادر علی شاہ کو جلاوطن کر کے لندن بھیج دیا گیا اور گدی کو ختم کر کے اس کی اراضی اور اثاثوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان دونوں بھائیوں کی تعلیم و تربیت لندن میں ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد سرکردہ راہ نماؤں کے توجہ دلانے پر، جن میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی شامل بتائے جاتے ہیں، وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم نے پیر صاحب آف پگارا کی گدی کو بحال کر کے ان کی جائیداد واگزار کی اور ان دونوں بھائیوں کو لندن سے بلا کر اس کا نظام ان کے سپرد کر دیا۔ قیام پاکستان کے وقت حروں کی ایک بڑی تعداد اپنی عسکری سرگرمیوں میں مصروف تھی، انہیں حکمت عملی کے ساتھ پاک فوج کا حصہ بنا لیا گیا۔

پیر صاحب آف پگارا اپنے ماضی کے حوالے سے بہت شاندار تاریخ رکھتے ہیں مگر وہ خود چونکہ مغربی ماحول کے تربیت یافتہ تھے اس لیے ان پر ان کے ماضی کا رنگ غالب نہ آسکا۔ میری ان سے کچھ عرصہ اس طرح رفاقت رہی ہے کہ ۷۷ء کے انتخابات اور تحریک نظام مصطفیٰؐ میں وہ پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ کی حیثیت سے پاکستان قومی اتحاد کے نو مرکزی قائدین میں شمار ہوتے تھے جنہیں ''نو ستاروں'' کے عنوان سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ پاکستان قومی اتحاد کے پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین تھے جبکہ بورڈ میں جمعیۃ علماء اسلام کی نمائندگی قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ اور راقم الحروف کیا کرتے تھے۔ اس

دوران پیر صاحب آف پگارا کی صدارت میں درجنوں اجلاسوں میں شرکت اور بحث و مباحثہ کا موقع ملا۔

تصوف کی لائن میں پیر صاحب آف پگارا کو ان ''فارورڈ صوفیاء'' میں شمار کیا جاسکتا ہے جو طریقت کو اصل اور شریعت کو اس کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور شریعت کے احکام کو بطور مقصد ضروری نہیں سمجھتے۔ میں نے ایک روز ان سے سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ کی نسبت سے الگ ملاقات کر کے اس پس منظر میں کچھ گفتگو کرنا چاہی تو ان کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے دوبارہ اس موضوع پر ان سے بات چیت کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مگر پاکستان کے استحکام اور سندھ میں قوم پرستوں کے علیحدگی پسندانہ رجحانات کا مقابلہ کرنے میں وہ ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ سندھ میں جب بھی لسانی حوالے سے یا قوم پرستی کے عنوان سے کوئی مسئلہ کھڑا ہوا پیر صاحب آف پگارا پاکستان اور وفاق کی علامت کے طور پر سامنے آئے۔ ملک کی وحدت و سالمیت کے لیے وہ ہمیشہ محب وطن پاکستانیوں کی ڈھارس ثابت ہوئے اور ان کا نام پاکستان کے چند عظیم محب وطن راہ نماؤں میں شمار ہوتا ہے۔

قومی سیاست میں ان کا انداز گفتگو منفرد تھا۔ ہم ان کی باتوں سے مستقبل کے اندازے لگاتے تھے اور ان کے منفرد سیاسی تکلم کا حظ اٹھاتے تھے۔ ان کی بعض سیاسی پیش گوئیاں پوری بھی ہوجاتی تھیں جو وہ ذو معنی الفاظ اور جملوں کے ذریعے کر دیا کرتے تھے۔ آج صبح اخبار میں ان کی وفات کی خبر پڑھ کر میری اہلیہ ام عمار نے کہا کہ پیر صاحب آف پگارا کی ایک اور پیشین گوئی پوری ہوگئی ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون سی؟ تو کہنے لگیں کہ پیر صاحب نے چند روز پہلے کہا تھا کہ ''انتخابات میری زندگی میں ہوتے نظر نہیں آتے۔''

پیر صاحب آف پگارا اپنے حال کے حوالے سے بہت سے سوالات کا عنوان ہونے کے باوجود ایک محب وطن قومی سیاست دان کے طور پر ہمارے لیے قابل احترام ہیں اور ان کے ماضی کے ساتھ ہماری گہری عقیدت وابستہ ہے۔ اس ماضی کی ایک جھلک پیر صاحب مرحوم کے ایک عقیدت مند کے قلم سے ملاحظہ فرمالیجیے:

> ''برطانوی سامراجیوں نے پیر صاحب آف پگارا سید صبغۃ اللہؒ کی تحریک کو نہایت بے دردی سے کچل ڈالا۔ آزادی کے متوالے مردان آزاداں جو ''حر'' کہلاتے تھے، حریت کی اس بے مثال تحریک میں قربانیوں کے قصے تاریخ پر ثبت کرتے چلے گئے۔ حروں نے

گوریلا جنگ لڑی، ان پر قابو پانے کے لیے پورے سندھ پر فوجی آپریشن ہوا، توپ خانہ اور فضائیہ تک استعمال کی گئی، سید صبغۃ اللہ شاہؒ کو گرفتار کر لیا گیا۔ پیر صاحب پگارا سید صبغۃ اللہ شاہؒ کو فوجی عدالت نے موت کی سزا دی، مہینوں مارشل لاء کے تحت مقدمہ چلتا رہا، سزا کا فیصلہ کر لیا گیا، لیکن صرف چند گھنٹے پہلے اس مرد حق کو اس کی اطلاع دی گئی۔ کیونکہ انگریز سامراجیوں کو یقین تھا کہ اگر سزائے موت کا پہلے اعلان کر دیا گیا تو حر مجاہدین اپنی جان کی بازی لگا کر بھی پیر صاحب کو لے جائیں گے اور کسی جیل کی دیواریں حر مجاہدین کے لیے ناقابل تسخیر ثابت نہ ہوں گی۔ سید صبغۃ اللہ شاہؒ کو جب بتایا گیا کہ چند گھنٹے بعد انہیں پھانسی کے تختے پر جانا ہے تو انہوں نے کسی اضطراب کا اظہار نہ کیا اور نوافل ادا کیے۔"

پیر صاحب آف پگارا سید مردان علی شاہ ہم سے رخصت ہوگئے ہیں اور قومی سیاست کا ایک اہم باب مکمل ہوگیا ہے۔ ان کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہیں اور کتاب ماضی اپنے اوراق پلٹ پلٹ کر ان کی سرگرمیوں کی جھلکیاں دکھا رہی ہے۔ قومی سیاست کو شاید اب اس قسم کا منفرد کردار میسر نہ آئے۔ میں ذاتی طور پر غمزدہ ہوں، پیر صاحب مرحوم کے ساتھ سیاسی رفاقت کے دور کی یادوں کے حوالے سے بھی، اور سندھ کے اس عظیم روحانی خاندان کے شاندار ماضی کے حوالے سے بھی۔ اور دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ پیر صاحب آف پگارا کی غلطیوں اور گناہوں سے درگزر فرمائیں، ان کی حسنات و خدمات کو شرف قبولیت سے نوازیں اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳ جنوری ۲۰۱۲ء)

پروفیسر غفور احمد مرحوم

پروفیسر غفور احمد اللہ کو پیارے ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اخبارات میں ان کی وفات کی خبر پڑھ کر ماضی کے بہت سے اوراق ذہن کی یادداشت میں کھلتے چلے گئے۔ ان کا نام پہلی بار ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد سنا جب وہ کراچی سے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ میرا تعلق جمعیۃ علماء اسلام پاکستان سے تھا اور اس دور میں جمعیۃ علماء اسلام اور جماعت اسلامی

میں مخاصمت دینی اور سیاسی دونوں محاذوں پر عروج پر تھی۔ مجھے مولانا عبداللہ درخواستیؒ، مولانا عبیداللہ انورؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے قریبی کارکنوں میں شمار ہونے کا اعزاز حاصل تھا، اس لیے جماعت اسلامی کے منتخب ارکان اسمبلی کے حوالے سے کسی مثبت سوچ کا اس وقت کوئی امکان نہیں تھا، لیکن خدا گواہ ہے کہ جوں جوں پروفیسر غفور احمد پارلیمانی اور سیاسی محاذ پر آگے بڑھتے گئے، قلب و ذہن کے دریچے ان کے لیے کھلتے چلے گئے اور ان کی شرافت و متانت اور حوصلہ و تدبر دیکھ کر ان کے احترام کی طرف بتدریج مائل ہوتا رہا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں دستوری طور پر سب سے بڑا اور پہلا مرحلہ دستور سازی کا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں منتخب ہونے والی قومی اسمبلی دراصل دستور سازی کے عنوان پر منتخب ہوئی تھی اور دستور سازی کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد اسے قانون ساز اسمبلی کی حیثیت اختیار کر لینا تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن عددی لحاظ سے کچھ قابل ذکر نہیں تھی، لیکن شخصیات کے حوالے سے اتنی مضبوط اپوزیشن شاید ہی قومی اسمبلی کو کبھی میسر آئی ہو۔ خان عبدالولی خانؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، مولانا عبدالحقؒ، چودھری ظہور الٰہی اور پروفیسر غفور احمد جیسی بھاری بھرکم شخصیات اس اپوزیشن کی قیادت کر رہی تھیں اور اسلامی سوشلزم کے نعرے پر الیکشن جیتنے والی پاکستان پیپلز پارٹی کی اکثریت والے ایوان میں دستور کو واضح اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے اور اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دلوانے کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کو قانون سازی میں قرآن و سنت کے دائرے میں پابند بنانا ۱۹۷۳ء کے دستور کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جن پر آج بھی اس ایوان کو فخر ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے دستور سازی کے ہوم ورک میں اپوزیشن کی طرف سے مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور پروفیسر غفور احمد کی شبانہ روز محنت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

دستور کی منظوری اور نفاذ کے ساتھ ہی قومی اسمبلی کے سامنے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ پیش آگیا۔ اس مسئلے کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے جس کا ذکر بات کو طویل کر دے گا، لیکن ہوا یہ کہ قادیانیوں کی اپنی ایک حماقت کی وجہ سے کہ چناب نگر (ربوہ) کے ریلوے سٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے سٹوڈنٹس پر قادیانی نوجوانوں نے حملہ کر دیا، ملک بھر میں اس پر احتجاجی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس احتجاج نے بھرپور عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور قومی اسمبلی کو اس پر قانون

سازی کرنا پڑی۔ مسئلہ ختم نبوت پر قانون سازی کے اس مرحلے میں بھی پروفیسر غفور احمد نے سرگرم حصہ لیا۔ پروفیسر صاحب کا مزاج عام طور پر ذہن سازی اور لابنگ کے ذریعے اپنی بات کو موثر بنانے کا ہوتا تھا اور وہ اس میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔

مجھے ان کے ساتھ قومی اتحاد میں ۱۹۷۷ء کے الیکشن اور تحریک نظام مصطفی کے دوران کام کرنے کا موقع ملا۔ پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمودؒ تھے اور سیکرٹری جنرل چودھری رفیق احمد باجوہ مرحوم چنے گئے جن کا تعلق جمعیۃ العلماء پاکستان سے تھا، جبکہ پنجاب میں قومی اتحاد کے صدر محترم حمزہ تھے اور سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی کے رہنما پیر محمد اشرف تھے۔ بعد میں ایک مرحلے میں رفیق احمد باجوہ اور پیر محمد اشرف دونوں ان مناصب سے کسی وجہ سے الگ ہوگئے تو مرکز میں پروفیسر غفور احمد اور پنجاب میں مجھے سیکرٹری جنرل بنادیا گیا۔ اس حیثیت سے ہمارا رابطہ پاکستان قومی اتحاد کی تحلیل تک مسلسل رہا۔ پاکستان قومی اتحاد کے اجلاسوں کے علاوہ بھی تنظیمی حوالے سے ہمارا رابطہ رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران میں نے کراچی میں پروفیسر غفور احمد مرحوم کے گھر میں بھی حاضری دی اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی سنجیدگی، متانت اور تدبر سے ان کا ہر ملنے والا متاثر تھا۔ مجھے بھی ان کے دھیمے رویے، مضبوط موقف اور سب کے احترام پر مبنی لہجے نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی میں، جو دراصل الیکشن میں دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی تحریک تھی، لیکن چونکہ قومی اتحاد نے نظام مصطفی کے نفاذ کے نعرے پر انتخاب لڑا تھا، اس لیے فطری طور پر اس تحریک نے بھی تحریک نظام مصطفیٰؐ کا عنوان اختیار کر لیا، اس تحریک کی قیادت میں مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز خان مزاری، چودھری ظہور الٰہی، پیر آف پگارہ شریف، سردار محمد عبد القیوم خان اور میاں طفیل مرحوم کے نام نمایاں تھے۔ لیکن اس کے تنظیمی اور دفتری معاملات کو کنٹرول کرنے والی ٹیم کو پروفیسر غفور احمد کی مدبرانہ رہنمائی میسر تھی جو اس تحریک کا ایک اہم کردار ہے۔ قومی اتحاد نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی کابینہ میں شمولیت اختیار کی تو پروفیسر غفور احمد مرحوم بھی وفاقی وزیر بنے۔ اس سے قبل وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ مذاکرات میں پاکستان قومی اتحاد کے سہ رکنی وفد میں مولانا مفتی محمود اور نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کے

ساتھ شامل رہ چکے تھے۔ اس دور کی یادداشتیں کتابی شکل میں ''پھر مارشل لاء آگیا'' کے عنوان سے قلم بند کر کے انہوں نے شائع کر دی ہیں۔

پروفیسر غفور احمد کا شمار محب وطن، دیانت دار، بااصول اور حق گو سیاسی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ قحط الرجال کے اس دور میں ان کی وفات سے یقیناً بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۱۳ء)

جناب نیلسن منڈیلا

نیلسن منڈیلا تحریک آزادی کے عالمی لیڈروں میں سے تھے جنہوں نے نہ صرف جنوبی افریقہ کی آزادی کے لیے طویل جنگ لڑی بلکہ دنیا کے نقشے پر دکھائی دینے والی نسلی امتیاز کی دو آخری نشانیوں میں سے ایک کے خاتمہ کی راہ ہموار کی۔ نیلسن منڈیلا سے قبل جنوبی افریقہ سفید فام، سیاہ فام اور انڈین کہلانے والے باشندوں کے درمیان تقسیم تھا۔ تینوں کی آبادیاں الگ الگ تھیں، رہن سہن الگ الگ تھا اور حقوق و مفادات کے معیارات الگ الگ تھے۔ گوروں کی حکومت تھی اور سیاہ فام اکثریت غلاموں جیسی زندگی بسر کر رہی تھی۔ انڈین کہلانے والی آبادی جو مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر مذاہب کے لوگوں پر مشتمل تھی اور جس میں انڈونیشیا وغیرہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی شامل تھے، اپنی الگ شناخت رکھتی تھی۔ انڈین کمیونٹی تجارت و سیاست میں قدرے بیدار و متحرک ہونے کی وجہ سے سیاہ فاموں سے کسی حد تک مختلف معیار کی حامل تھی۔ اس نسلی تفریق و امتیاز اور گوروں کی اقلیتی حکومت کے خلاف نیلسن منڈیلا نے آزادی کا پرچم بلند کیا، زندگی کے کم و بیش تین عشرے جیل میں گزارے اور عدم تشدد پر مبنی پر امن جدوجہد کے نتیجے میں اپنی قوم کو آزادی کی منزل سے ہمکنار کرنے میں بالآخر کامیاب ہو گئے۔

میں جنوبی افریقہ کے حالیہ سفر کے دوران اس جیل کے سامنے سے گزرا ہوں جس کے بارے میں بتایا گیا کہ نیلسن منڈیلا نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس کی سلاخوں کے پیچھے بسر کیا ہے۔ نسلی امتیاز کے خاتمہ کے لیے گزشتہ صدی کے دو بڑے لیڈروں کا نام تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ امریکہ کے

مارٹن لوتھر کنگ اور جنوبی افریقہ کے نیلسن منڈیلا۔ دونوں کی جدوجہد میں یہ بات قدرِ مشترک تھی کہ انہوں نے سیاہ فام لوگوں کو سفید فام لوگوں کی بالاتری اور بالادستی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کی اور دونوں کی جدوجہد تشدد سے ہٹ کر خالصتاً پرامن سیاسی تحریک پر مبنی تھی۔ البتہ مارٹن لوتھر کنگ نے امریکی دستور اور حکومت کے تحت رہتے ہوئے سیاہ فام باشندوں کے لیے برابر کے سیاسی و شہری حقوق کے لیے کامیاب جدوجہد کی، جبکہ نیلسن منڈیلا گوری اقلیت کی حکومت کے خاتمہ اور جمہوری بنیادوں پر ملک میں اکثریتی حکومت کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے، دونوں نے نسلی امتیاز کے خاتمہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ دونوں کے ملکوں میں ان کی جدوجہد سے پہلے دور کے نسلی امتیاز کی نشانیاں اور آثار کچھ نہ کچھ اب بھی پائے جاتے ہیں، میں نے امریکہ اور جنوبی افریقہ دونوں جگہ گھوم پھر کر ان آثار کا مشاہدہ کیا ہے جو ماضی کی تلخ یادوں کی غمازی کرتے ہیں، اور انہیں دیکھ کر ان دونوں لیڈروں کی عزیمت واستقامت اور صبر وحوصلہ کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔

میں ۵ دسمبر جمعرات کو جوہانسبرگ سے سعودیہ ایئرلائن کے ذریعہ جدہ کی طرف روانہ ہوا تو اس وقت تک مجھے کوئی خبر نہیں تھی، مگر ایک رات جدہ ایئرپورٹ پر گزارنے کے بعد جمعہ کی شام کو لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ نیلسن منڈیلا اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے ہیں۔ ایک عظیم حریت پسند راہ نما اور عوام دوست لیڈر کی وفات پر صدمہ ہوا اور دل جنوبی افریقہ کے عوام کے غم میں شریک ہوگیا۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۱۴ء)

مجید نظامی مرحوم

ملک کے بزرگ صحافی، نظریۂ پاکستان کے بے باک ترجمان، حب الوطنی کی علامت اور صحافت کی باوقار آزادی کے علمبردار ڈاکٹر مجید نظامی ہم سے رخصت ہوگئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ میں ان کا اس وقت سے قاری چلا آرہا ہوں جب وہ لندن میں روزنامہ نوائے وقت کی نمائندگی کرتے تھے اور وہاں کے حالات و واقعات سے اپنے ملک کے شہریوں کو باخبر رکھنے کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ نوائے وقت کے بانی حمید نظامی مرحوم کو میں نے دیکھا نہیں مگر کچھ نہ کچھ پڑھا ضرور ہے۔ میں اپنے بچپن اور نوجوانی کے دور میں آغا شورش کاشمیری مرحوم کی خطابت وصحافت کا پرجوش سامع و قاری رہا ہوں

اور مطالعہ کا ذوق پیدا ہوتے ہی نوائے وقت اور ہفت روزہ چٹان میرے مطالعہ کا ناگزیر حصہ بن گئے تھے۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کی حمید نظامی مرحوم کے ساتھ دوستی بھی تھی اور بعض مسائل میں اختلاف کا اظہار بھی بے تکلفانہ انداز میں ہو جاتا تھا۔ نظامی برادران کے ساتھ میرا تعلق بھی کچھ اسی طرح کا رہا ہے۔

مجید نظامی مرحوم، بڑے نظامی صاحب کی وفات کے بعد لندن سے لاہور منتقل ہوئے اور نوائے وقت کی ادارت سنبھالی۔ پھر اختلافات کا وہ دور گزرا جب انہیں نوائے وقت سے الگ ہو کر ندائے ملت کے نام سے نیا روزنامہ نکالنا پڑا اور اس کے بعد مصالحت ہوئی اور انہوں نے نوائے وقت کے ایڈیٹر ان چیف کی حیثیت سے تحریک پاکستان کے اس نمائندہ قومی اخبار کی سربراہی سنبھالی۔ یہ سب مراحل میرے سامنے ہیں، اس دوران ان کے بارے میں جو تاثر قائم ہوا وہ آج تک اسی کیفیت میں قائم ہے کہ وہ اپنے نظریات و رجحانات اور اصولوں کی پاسداری میں بے لچک اور دوٹوک طرز عمل رکھتے ہیں۔ اور ان سے ایسے معاملات میں کسی سودے بازی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کے نظریہ اور اصول سے اختلاف کیا جا سکتا تھا مگر اپنے نظریہ اور اصول کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ اس وجہ سے میرے دل میں ہمیشہ احترام رہا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔

مجید نظامی مرحوم کے ساتھ میری متعدّد ملاقاتیں ہوئی ہیں اور مختلف امور پر بات چیت بھی ہوئی ہے۔ خصوصاً دینی تحریکات کے دوران یہ ملاقاتیں ایک کارکن کے طور پر میری ذمہ داریوں کا حصہ رہی ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دینی تحریکات بالخصوص تحفظ ختم نبوت، تحفظ ناموس رسالت اور تحریک نظام مصطفیٰؐ میں قومی سطح پر جن صحافیوں نے ایک ذمہ دار صحافی کے ساتھ ساتھ راہ نما اور مشیر کا کردار ادا کیا ہے ان میں ڈاکٹر مجید نظامی، جناب مصطفیٰ صادق اور جناب مجیب الرحمان شامی سرفہرست ہیں۔ پہلے دو بزرگ وفات پا گئے ہیں، شامی صاحب محترم کا دم غنیمت ہے، اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں اور قومی صحافت میں آبرومندانہ کردار تادیر ادا کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

۱۹۷۶ء کی بات ہے گوجرانوالہ میں مسجد نور اور مدرسہ نصرۃ العلوم کو سیاسی انتقام کے طور پر پی پی

حکومت نے محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا۔ اس لیے کہ مسجد و مدرسہ کا تعلق جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ تھا اور قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر مولانا مفتی محمودؒ نے مسجد نور میں منعقدہ بہت بڑے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے حکومتی پالیسیوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اس موقع پر ہم نے گوجرانوالہ میں مزاحمتی تحریک شروع کی اور کم و بیش چار ماہ تک شہر کی سڑکوں پر ہنگامہ بپا کیے رکھا جس کی وجہ سے حکومت کو اپنا نوٹیفیکیشن واپس لینا پڑا۔ اس حوالہ سے میں مجید نظامی صاحب مرحوم سے ان کے دفتر میں ملا اور تحریک کے سلسلہ میں سرپرستی اور راہ نمائی کی درخواست کی۔ انہوں نے کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن یہ سمجھ لیں کہ یہ ''ٹیسٹ کیس'' ہے، اگر آپ لوگ ڈھیلے پڑ گئے تو ملک کے دیگر مدارس پر سرکاری کنٹرول کا دروازہ کھل جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ہم اسے ''ٹیسٹ کیس'' سمجھ کر ہی لڑ رہے ہیں جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے دوران میں پاکستان قومی اتحاد صوبہ پنجاب کا سیکرٹری جنرل تھا۔ اس حوالہ سے متعدّد بار نظامی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی اور جب بھی حاضر ہوا انہوں نے احترام و محبت سے نوازا اور مفید مشورے دیے۔

مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی نے ایک بار بتایا کہ تحریک ختم نبوت کے کچھ راہ نما مجید نظامی مرحوم صاحب سے ملے اور تحریک ختم نبوت کی تاریخ اور قومی اخبارات سے اس کا ریکارڈ جمع کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے لیکن اس سلسلہ میں آپ زاہد الراشدی صاحب سے رابطہ قائم کریں وہ یہ کام زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی رکھتے ہیں۔ میں ڈاکٹر مجید نظامی مرحوم کے ان ریمارکس کو اپنے لیے اعزاز کی بات سمجھتا ہوں اور اس سے ان کے ساتھ میرے قلبی تعلق میں یقیناً اضافہ ہوا۔

میں نے بعض معاملات میں ان کے موقف اور طرز عمل سے اختلاف بھی کیا اور انہوں نے ہمیشہ نوائے وقت کے صفحات میں میرے اختلافی موقف کو جگہ دی۔ ایک بار میں نے ان سے کسی دوست کی شکایت کے بارے میں بات کی کہ نوائے وقت ان کے مضامین شائع نہیں کرتا تو نظامی صاحب نے مسکراتے ہوئے مجھے کہا کہ کیا آپ کا مضمون کبھی ہم نے روکا ہے؟ پھر انہوں نے اس کی وضاحت کی کہ جس مضمون میں بہت زیادہ کانٹ چھانٹ کرنی پڑے اسے شائع کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کا مضمون چونکہ جچا تلا ہوتا ہے اور اس میں زیادہ ردوبدل نہیں کرنا پڑتا اس لیے ہم اسے شائع کر دیتے ہیں۔

آج ڈاکٹر مجید نظامی مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی بہت سی یادیں ذہن میں تازہ ہو رہی ہیں، اللہ تعالٰی انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۹ جولائی ۲۰۱۴ء)

شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود مرحوم

المملکۃ العربیۃ السعودیۃ کے فرمانروا خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز گزشتہ دنوں انتقال کر گئے ہیں۔ اس سے نہ صرف سعودی عرب بلکہ عالم اسلام ایک مخلص اور مدبر راہ نما سے محروم ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ عبداللہؒ کم وبیش نصف صدی سے سعودی عرب کے حکومتی نظام کا اہم حصہ چلے آرہے تھے اور شاہ فہدؒ کی وفات کے بعد انہوں نے سعودی عرب کے فرمانروا کے طور پر منصب سنبھالا تھا۔ انہوں نے عالم اسلام کی وحدت، مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور دینی حلقوں کی معاونت کے لیے اپنے پیشرو حکمرانوں کی طرح خصوصی محنت کی ہے اور بہت سے حوالوں سے انہیں ایک بیدار مغز اور ترقی پسند حکمران کے طور پر عالمی حلقوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ مملکت سعودی عرب کے قیام کو ایک صدی ہونے کو ہے اور آل سعود نے آل شیخؒ کے تعاون سے سعودی عرب کے اسلامی امتیاز و تشخص اور حرمین شریفین کی خدمت کے میدانوں میں جو سعی و محنت تسلسل کے ساتھ کی ہے وہ اسلامی تاریخ کے ایک اہم باب کے طور پر یاد رکھی جائیں گی۔

عالمی ماحول اور سیاسیات میں آل سعود کی ترجیحات کے بارے میں ہمارے جیسے نظریاتی کارکنوں کو ہر دور میں تحفظات رہے ہیں جو آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ان کے امکانات کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اب سے ایک صدی قبل خلافت عثمانیہ کے بکھر جانے اور عالم عرب میں وسیع تر جغرافیائی اکھاڑ پچھاڑ کے موقع پر انہوں نے حجاز و نجد اور ان کے اردگرد کے بہت سے علاقوں کو المملکۃ العربیۃ السعودیۃ کے نام سے وحدت کے دائرہ میں شامل کیا اور حرمین شریفین کے گرد ایک وسیع سلطنت کا حصار قائم کر دیا،

جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے حوصلوں کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ اور عالم اسلام نے سعودی حکومت کو خلافت عثمانیہ کے متبادل کے طور پر اپنے دلوں میں جگہ دی۔ حتیٰ کہ سعودی مملکت کے بانی شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں برصغیر پاک و ہند کے اکابر علماء کرام جن میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ بھی شامل تھے، یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ خلافت کا اعلان کردیں تو انہیں عالم اسلام میں امیر المومنین کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ اس وقت کے حالات کا جبر تھا کہ شاہ عبد العزیزؒ نے مملکت کے ٹائٹل کو ترجیح دی۔ البتہ ملک کے داخلی ماحول میں احکام شریعت کے نفاذ کی طرف عملی پیش رفت کرکے اس خلا کو زیادہ محسوس نہیں دیا اور اس کے ساتھ ہی الشیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی رحمہ اللہ تعالیٰ کے علمی و دینی خاندان کو اپنے ساتھ شریک کار بنا کر اس دینی چھاپ کو اور زیادہ گہرا کردیا۔

شاہ عبد العزیزؒ اور ان کے بیٹوں شاہ سعودؒ، شاہ فیصلؒ، شاہ خالدؒ، شاہ فہدؒ، اور شاہ عبد اللہؒ کے ادوار حکومت کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو تمام تر شکایات و تحفظات کے باوجود یہ بات حقیقت ہے کہ

- عالمی ماحول اور عالم اسلام کی معروضی صورت حال میں انہوں نے سعودی عرب میں شرعی احکام و قوانین کے نفاذ کے بارے میں کوئی دباؤ قبول نہیں کیا، اور اپنی مملکت اور بساط کے دائرہ میں قرآن و سنت کی عملداری کو بہت حد تک قائم رکھا ہے۔
- حرمین شریفین کی ترقی و توسیع اور انتظام و انصرام میں والہانہ جذبہ کے ساتھ سعی و محنت کی، جس کے ثمرات و آثار کھلی آنکھوں سے سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔
- حج و عمرہ کے لیے آنے والے زائرین کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنا ان کی ہمیشہ ترجیحی پالیسی رہی ہے۔ اور اگر حجاج کرام کو دستیاب موجودہ سہولتوں کا آج سے ایک صدی سے قبل کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو آل سعود کی خدمات کے اس پہلو پر خراج تحسین پیش نہ کرنا ناشکری قرار پاتا ہے۔
- دنیا کے مختلف حصوں میں آفات اور ظلم و جبر کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی امداد اور ان کی بحالی کے لیے سعودی عرب کا کردار ہمیشہ مثالی رہا ہے۔ اور اس میں پیش رفت مسلسل جاری رہتی ہے۔
- دنیا بھر میں قرآن و سنت کی تعلیمات کا فروغ اور دینی تعلیم کی حوصلہ افزائی اس حکمران

خاندان کی روایت چلی آرہی ہے۔

- عالم اسلام کی وحدت اور ملت اسلامیہ میں یگانگت کے فروغ کے لیے سعودی حکومت مستقل طور پر سرگرم عمل رہتی ہے۔
- سعودی عرب میں امن کے قیام اور خاص طور پر حرمین شریفین میں نظم و وحدت کا ماحول برقرار رکھنے میں سعودی حکومت کی پالیسی قابل داد چلی آرہی ہے۔

ان پالیسیوں کے تسلسل کو جاری رکھنے میں شاہ عبداللہؒ نے مختلف حیثیتوں میں اپنا کردار ادا کیا ہے، اس لیے ان کی جگہ لینے والے شاہ سلمان بن عبدالعزیز حفظہ اللہ تعالیٰ سے بجا طور پر یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ نہ صرف ان پالیسیوں کو جاری رکھیں گے بلکہ ان میں مزید بہتری پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور ان تحفظات و شکایات کی طرف بھی توجہ دیں گے جن کا عالم اسلام کے مختلف حلقوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اظہار کیا جاتا ہے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز رحمہا اللہ تعالیٰ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی دینی و ملی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔ اور ان کے جانشین شاہ سلمان بن عبدالعزیز حفظہ اللہ تعالیٰ کو خادم الحرمین الشریفین کی حیثیت سے سعودی عرب، عالم اسلام اور امت مسلمہ کی خدمت سرانجام دیتے رہنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء)

سردار محمد عبدالقیوم خان مرحوم

(۱)

آج طالبان اور افغان حکومت کے درمیان مذاکرات کے آغاز کے حوالہ سے لکھنا چاہ رہا تھا کہ مجاہد اول سردار محمد عبدالقیوم خان کی وفات کی خبر نے قلم روک لیا۔ اور یہ خبر دل کو غم واندوہ کی گہرائیوں میں لے گئی کہ تحریک آزادئ کشمیر کے نامور راہ نما اور پاکستان کی قومی سیاست کے ایک اہم نظریاتی کردار سردار محمد عبدالقیوم خان طویل علالت کے بعد ۹۱ برس کی عمر میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے ہیں، انا

للہ وانا الیہ راجعون۔

سردار صاحب کے ساتھ میرا بہت قریبی تعلق رہا ہے اور میں ان کی تحریکی اور سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کے مختلف مراحل کا عینی گواہ ہوں، بلکہ بعض مراحل میں شریک کار بھی رہا ہوں۔ میں نے پہلی بار انہیں کم و بیش نصف صدی قبل اس وقت دیکھا جب انہوں نے آزادئ کشمیر کے لیے ''مجاہد فورس'' کے نام سے رضا کاروں کی بھرتی کے لیے مہم شروع کر رکھی تھی۔ گوجرانوالہ میں ایک تقریب اسی سلسلہ میں انعقاد پذیر تھی، سردار صاحب مرحوم اس کے مہمان خصوصی تھے، ان کے ایک سرگرم رفیق کار مولانا عبد العزیز راجوروی مرحوم مختلف دینی و سیاسی تحریکات میں ہمارے رفقاء کار میں سے تھے اور ہم جیل کے ساتھی بھی رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے سردار محمد عبد القیوم خان سے خصوصی ملاقات کا موقع ملا، یہ ان کی بھرپور جوانی کا دور تھا، سرمئی رنگ کے ملیشیا کے سوٹ میں ملبوس ان کی سادہ شخصیت نے دل پر اثر کیا، جبکہ ان کی نظریاتی گفتگو نے یہ رنگ گہرا کر دیا، جس کی گہرائی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان کے دور حکومت میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی نے سردار محمد ایوب خان مرحوم کی تحریک پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تو سردار محمد عبد القیوم خان اور آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے ساتھ قلبی محبت دو چند ہو گئی۔

پھر انہیں باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے زیر اہتمام منعقدہ ''آئین شریعت کانفرنس'' میں سنا تو ان کے خطاب سے اندازہ ہوا کہ وہ آزادئ کشمیر کے ساتھ ساتھ شریعت اسلامیہ کے نفاذ و ترویج میں بھی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس کا عملی اظہار انہوں نے اپنے مختلف ادوارِ حکومت میں ریاست آزاد جموں و کشمیر میں نظام اسلام کے نفاذ کے لیے مؤثر اقدامات کے ذریعہ کیا جس کے اثرات آج بھی موجود و مستحکم ہیں۔ آزاد کشمیر میں نفاذ شریعت کے لیے سردار محمد عبد القیوم خان مرحوم کی جدوجہد، اقدامات اور ان کے اثرات پر ایک مستقل تحقیقی اور تجزیاتی مقالہ کی ضرورت ہے جو صحیح طور پر مرتب ہو جائے تو نفاذ شریعت کی جدوجہد کے کارکنوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایم فل یا پی ایچ ڈی کا کوئی باذوق اسکالر اس کام کا بیڑا اٹھائے اور مشاورت کے درجہ میں میری بھی اس میں تھوڑی بہت شرکت ہو جائے۔

سردار محمد عبد القیوم خان مرحوم کی سیاست آزاد ریاست جموں و کشمیر تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ

پاکستان کی قومی سیاست کا بھی ایک متحرک کردار رہے ہیں۔ آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے بانی و قائد چودھری غلام عباس مرحوم کی طرح ان کے جانشین کی حیثیت سے سردار محمد عبدالقیوم خان مرحوم بھی پاکستان کی قومی سیاست میں سرگرم رہے ہیں اور اس طور پر ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی راہ نما کی حیثیت سے ان کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔ اور یہ دور ان کے ساتھ میری رفاقت کا دور ہے، وہ پاکستان قومی اتحاد کے ''نوستاروں'' میں سے تھے۔ یہ اصطلاح پاکستان قومی اتحاد میں شامل نو سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی جن میں سردار صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ جبکہ مجھے پنجاب میں پاکستان قومی اتحاد کے صوبائی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کئی سال تک خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ اس دوران خلوت و جلوت کی بہت سی ملاقاتوں اور چھوٹے بڑے پروگراموں میں شرکت کے باعث سردار صاحب مرحوم کی شخصیت کے اور بہت سے پہلو سامنے آئے جن کے تذکرہ کا یہ مختصر کالم متحمل نہیں ہے۔ البتہ اس کی ایک جھلکی کے طور پر صرف ایک واقعہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

چند سال قبل آنے والے خوفناک زلزلہ میں ان کے بھائی اور بہت سے دیگر حضرات شہید ہو گئے تھے۔ میں سردار صاحب مرحوم سے تعزیت کے لیے ضلع باغ میں ان کی رہائش گاہ غازی آباد میں حاضر ہوا تو زلزلہ کے نقصانات اور اثرات کا ذکر کرتے ہوئے سردار صاحب یہ کہہ کر رونے لگ گئے کہ زلزلہ کے بھاری جانی و مالی نقصانات پر تو غم و دکھ ہوا ہی ہے، مگر میرے لیے یہ بات زیادہ غم اور رنج کا باعث بنی ہے کہ اتنی بڑی خدائی تنبیہ کے بعد دلوں میں نرمی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی جو صورت حال پیدا ہونی چاہیے تھی وہ نظر نہیں آ رہی، اور اس قدر خوفناک زلزلہ سے بھی ہمارے معاشرتی رویوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہ عمر میں مجھ سے دو عشرے آگے تھے لیکن ان کی دوستانہ بے تکلفی کے باعث میں انہیں اپنا ''بزرگ دوست'' کہا کرتا تھا۔ اور بعض اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ گزشتہ سال ان کی بیمار پرسی کے لیے راولپنڈی کے ''مجاہد ہاؤس'' میں حاضر ہوا تو علالت و کمزوری کے باوجود خاصی دیر گفتگو کرتے رہے۔ سخت جسمانی کمزوری کے عالم میں ان کے ذہنی استحضار اور مضبوط یادداشت نے بہت متاثر کیا۔ مختلف دینی و قومی مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا، ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ دیر ان کے

ساتھ رہوں بلکہ وہ دن ان کے ساتھ گزاروں جس کے لیے وہ بار بار کہتے رہے۔ مگر مجھے ایک اگلے طے شدہ پروگرام پر جانا تھا اس لیے اجازت لے کر روانہ ہو گیا۔

ان کی وفات کی خبر کو عام طور پر اسی حوالہ سے پڑھا جائے گا کہ ایک محب وطن سیاسی راہ نما اور سرکردہ کشمیری لیڈر دنیا سے رخصت ہو گیا ہے، لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میرا تاثر یہ ہے کہ عالمی فورم پر کشمیریوں کا ایک جرأت مند اور باشعور ترجمان دنیا سے منہ موڑ گیا ہے۔ اور پاکستان کی قومی سیاست ایک نظریاتی، مدبر، غیرت مند اور حوصلہ مند راہ نما سے محروم ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور ان کے فرزند و جانشین سردار عتیق احمد خان کو اپنے خاندان و رفقاء کے ہمراہ اپنے عظیم باپ کی روایات کو زندہ رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۵ء)

(۲)

سردار محمد عبد القیوم خان کے ساتھ میری علیک سلیک اس دور سے ہے جب وہ ممتاز کشمیری لیڈر چودھری غلام عباس خان مرحوم کے رفیق کار کی حیثیت سے کشمیری سیاست میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میری جماعتی زندگی (جمعیۃ علماء اسلام) کا ابتدائی دور تھا اور ان کا عنفوان شباب تھا۔ گوجرانوالہ میں آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے سرگرم راہ نما مولانا عبد العزیز راجوروی مرحوم ہمارے ساتھ دینی تحریکات میں متحرک رہتے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ اکٹھے جیل بھی گزاری ہے، بڑے زندہ دل اور دلیر سیاسی راہ نما تھے۔ سردار عبد القیوم خان جب جماعتی مصروفیات میں گوجرانوالہ آتے تو مولانا راجوروی مرحوم کی وساطت سے ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ پھر سردار صاحب نے "المجاہد فورس" کے نام سے کشمیری نوجوانوں کو آزادیٔ کشمیر کے لیے منظم کرنے کا کام شروع کر دیا تو ان کی تگ و تاز کے مختلف مراحل ذہن میں ابھی تک تازہ ہیں۔ غالباً ۱۹۶۷ء کی بات ہے، جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے لاہور کے باغ بیرون دہلی دروازہ میں اپنی ملک گیر "آئین شریعت کانفرنس" میں خطاب کے لیے انہیں مدعو کیا۔ میں اس کانفرنس کے کارکنوں میں سے تھا اس لیے وہ منظر بھی ذہن کے نہاں خانے میں محفوظ ہے۔ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی موجودگی میں انہوں نے ہزاروں علماء کرام کے ملک گیر اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

سردار محمد عبد القیوم خان اقتدار میں آئے تو ان کے دو اقدامات کی وجہ سے ان کے ساتھ تعلق

خاطر میں اضافہ ہوا:

1. ایک یہ کہ اس دور میں جب پاکستان میں قادیانیوں کا نام لے کر کسی جلسے میں ان پر تنقید کرنے سے مقدمات اور دار وگیر کا سلسلہ شروع ہو جایا کرتا تھا، آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد منظور کی۔ یہ قرارداد باغ سے آزاد کشمیر اسمبلی کے رکن میجر (ر) محمد ایوب خان نے پیش کی تھی جو بعد میں آزاد کشمیر اسمبلی کے اسپیکر بھی بنے اور حالیہ زلزلے کے دوران شہید ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی پشت پر ان کے پارٹی لیڈر سردار عبدالقیوم خان تھے جنہوں نے اس تحریک کی پشت پناہی کی اور اس پر ملکی وغیر ملکی دباؤ کا سامنا کیا۔
2. ان کا دوسرا اقدام آزاد کشمیر میں ضلعی سطح پر افتاء اور قضاء کا نظام ہے کہ انہوں نے اپنے پہلے دور اقتدار میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے ضلعی سطح پر مشترکہ عدالتی نظام وضع کیا جس کے تحت سیشن جج اور ضلع قاضی اکٹھے بیٹھ کر مقدمات سنتے ہیں اور شریعت سے متعلق معاملات میں مشترکہ فیصلے کرتے ہیں۔ شرعی قوانین دستوری طور پر پاکستان میں بھی نافذ ہیں لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے مناسب عدالتی نظام مہیا نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اسلامی قوانین کا نفاذ ہمارے ہاں صرف کاغذوں، قراردادوں اور پروپیگنڈے تک محدود ہے، مگر آزاد کشمیر میں اسلامی قوانین کے لیے مذکورہ بالا صورت میں ایک عدالتی نظام فراہم کیا گیا ہے جس کی وجہ سے آزاد کشمیر میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر بہت سے شرعی قوانین کے تحت فیصلے ہوتے ہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا ہے۔

برطانوی دور کے یادگار نوآبادیاتی عدالتی نظام کے ساتھ شرعی قضاء کے نظام کو منسلک کرنے اور سیشن جج صاحبان کے ساتھ ساتھ علماء کرام کو قاضی کے طور پر اکٹھا بٹھانے میں انہیں جس دباؤ اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا میں ان سے آگاہ ہوں، اس لیے تمام تر تحفظات کے باوجود یہ کہا کرتا ہوں کہ آزاد کشمیر کے عدالتی سسٹم میں تحصیل اور ضلع کی سطح پر یہ نظام اگر قائم ہوا ہے اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے تو اس کے پیچھے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم اور ان کے ساتھ بالغ نظر علماء کرام کی ٹیم کی فراست کے ساتھ ساتھ سردار محمد عبدالقیوم خان اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی

قیادت کے حوصلے اور جرأت کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اور اسلامائزیشن کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر اسے نظر انداز کرنا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

پاکستان قومی اتحاد کے دور میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ قومی اتحاد کے نو ستاروں میں سے تھے اور میں پنجاب قومی اتحاد کا سیکرٹری جنرل تھا۔ کئی برس تک یہ رفاقت قائم رہی اور تعلقات میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سردار محمد عبد القیوم خان کی سیاست سے مجھے کوئی سروکار نہیں کہ وہ بہرحال ایک سیاست دان ہیں اور ہمارے ملک کی معروضی سیاست کے سمندر میں انہیں بھی وہ غوطے لگانے پڑتے رہے ہیں جو اب ہمارے سیاست دانوں کی علامت اور پہچان بن گئے ہیں۔ ان کے سیاسی طرز عمل کے بہت سے پہلوؤں سے مجھے اتفاق نہیں ہے اور آزاد کشمیر کے کئی کھلے جلسوں میں اس حوالے سے میں نے ان پر متعدّد بار تنقید بھی کی ہے، لیکن ان کی دو باتوں سے بہرحال میں متاثر ہوں اور ان کے اظہار میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔

1. ایک یہ کہ اسلام، پاکستان اور آزادیٔ کشمیر کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ بے لچک ہے اور ان میں سے کسی مسئلے پر ان کے رویے میں نارواانرمی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔
2. اور دوسری بات یہ کہ وہ صاحب مطالعہ اور باخبر سیاست دان ہیں اور ان معدودے چند قومی راہ نماؤں میں سے ہیں جو کسی متعلقہ مسئلے پر بریفنگ لینے کی بجائے اکثر اوقات بریفنگ دینے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان۔ ۲۶ نومبر ۲۰۰۵ء)

ملا محمد عمر مجاہدؒ

(۱)

گزشتہ ماہ کے دوران افغان طالبان کی طرف سے اس خبر کی تصدیق کر دی گئی کہ ان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد کا انتقال ہو گیا ہے (اناللہ وانا الیہ راجعون) اور طالبان شوریٰ نے ان کے نائب ملا اختر منصور کو ان کی جگہ نیا امیر چن لیا ہے۔

ملا محمد عمرؒ روسی استعمار کے خلاف افغان جہاد میں شریک رہے ہیں، اس میں زخمی بھی ہوئے تھے

اور ان کی ایک آنکھ متاثر ہوگئی تھی۔ لیکن وہ گمنامی کے اندھیروں میں اس وقت ایک چمکدار ستارے کی مانند نمودار ہوئے جب سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان بین الاقوامی طاقتوں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق ایک نئی اور وسیع تر خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ کابل پر قبضے کی بڑی جنگ کے ساتھ ساتھ افغان مجاہدین اور تحلیل شدہ سابقہ سرکاری افغان فوج کے مختلف گروپ افغانستان کے بہت سے علاقوں میں باہم برسرپیکار تھے۔ پورا افغانستان افراتفری کا شکار تھا، سرداروں کی اس جنگ (لارڈز وار) نے افغانستان کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا اور شاید بہت سی بڑی طاقتیں بھی یہی چاہتی تھیں۔ مگر قندھار کے ایک گمنام طالب علم نے اپنے طالب علم ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور افغان عوام کو لارڈز وار کی نحوست سے نجات دلانے اور جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل یعنی نفاذ شریعت کو اپنا مقصد قرار دے کر یہ بے سروسامان طلبہ میدان میں نکل آئے۔

طالبان کا ابتدائی ہدف یہ تھا کہ کوئٹہ سے قندھار اور پھر مزار شریف تک کے تجارتی راستے پر علاقائی سرداروں نے جگہ جگہ ناکے لگا کر جبری ٹیکس وصول کرنے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اسے ختم کر کے تجارتی گزرگاہ کو محفوظ بنایا جائے۔ چونکہ ابتدائی لشکر کے زیادہ تر شرکاء دینی مدارس کے طلبہ تھے جو جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے مختلف جہادی گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے یہ لشکر طالبان کے نام سے معروف ہوا۔ اور پھر چند سو افراد سے شروع ہونے والا یہ لشکر رفتہ رفتہ ایک منظم فوج کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف تجارتی راستہ صاف کیا بلکہ جو علاقے ان کے کنٹرول میں آتے گئے وہاں شریعت اسلامیہ کے مطابق امارتی نظام قائم کر کے افغان عوام کو اسلامی قوانین کی برکات سے فیض یاب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس کا مشاہدہ و اعتراف ملا محمد عمرؒ کے پانچ سالہ دور حکومت میں عالمی سطح پر بھی کیا جاتا رہا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو ''امارت اسلامی افغانستان'' کا نام دیا اور دھیرے دھیرے کابل سمیت بیشتر افغانستان پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

ملا محمد عمرؒ کی طالبان حکومت کے تین کارناموں کا آج بھی بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے:

1. لارڈز وار کا خاتمہ یعنی سرداروں کی ان علاقائی حکومتوں اور باہمی جنگوں کا خاتمہ جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔
2. انہوں نے اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں عام افغان آبادی کو غیر مسلح کر دیا، یعنی ہر شخص سے

اسلحہ واپس لے کر افغانستان جیسے ملک میں ''وپین لیس سوسائٹی'' کا عملی نمونہ پیش کیا۔

3. ہیروئن بنانے والے پوست کی کاشت جو طالبان کے دور سے پہلے کبھی کنٹرول ہوئی اور نہ ہی ان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے اب تک ممکن ہو سکی ہے، بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق ملا محمد عمرؒ کے ایک حکم سے ایسے ختم ہوئی کہ ان کے حکومتی دائرہ میں شامل علاقوں میں ایک پودا بھی کاشت نہ ہونے کا محاورہ بولا جانے لگا۔

یہ تو وہ باتیں ہیں جو بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں کا حصہ ہیں اور ان کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے، جبکہ ہمارے نزدیک ان کے ساتھ ان امور کو شامل کرنا بھی ضروری ہے:

- شرعی احکام وقوانین کا عملی نفاذ اور عوام کو شریعت اسلامیہ کے مطابق انصاف کی فراہمی۔
- گڈ گورننس اور سادہ وفطری انداز حکمرانی کا ایسا نمونہ کہ بلاشبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی یاد تازہ ہوگئی۔
- امن عامہ اور لوگوں کی جان ومال اور آبرو کا اس درجہ میں تحفظ کہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے کابل کے بازاروں میں دکانداروں کو دکانیں کھلی چھوڑ کر نماز کے لیے مسجد میں جاتے دیکھا ہے۔

مجھے اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کبھی نہ بھولے گا کہ ایک بار میں چند روز کے لیے کابل گیا ہوا تھا۔ پل خشتی کی جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد بازار کی طرف نکلا تو چند سکھوں کی دکانیں دکھائی دیں۔ میں ایک دکان میں بلا تکلف گھس گیا اور ٹھیٹھ پنجابی زبان میں جب دکاندار کا حال احوال دریافت کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان گفتگو رہی، میں نے اس سے پوچھا کہ سردار جی! یہ مولوی جب سے آئے ہیں آپ کیا تبدیلی دیکھ رہے ہیں؟ اس نے بے تکلفی سے کہا کہ جب سے یہ مولوی آئے ہیں ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔ میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ پہلے ہر وقت خوف وہراس کی کیفیت رہتی تھی، میرے دو بیٹے جوان ہیں، ہم تینوں باری باری آٹھ آٹھ گھنٹے پہرہ دیتے تھے، اور باقی گھر والے سوتے تھے۔ جب سے ان مولویوں کی حکومت آئی ہے ''ایہہ مولبی پہرہ دیندے آ، تے اسی سکھ دی نیند سوندے ہاں''۔ یہ مولوی پہرہ دیتے ہیں اور ہم آرام کی نیند سوتے ہیں۔

مجھے کابل اور قندھار دونوں جگہ ملا محمد عمرؒ سے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا ہے اور طالبان حکومت کے متعدّد راہ نماؤں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئی ہیں جن کے کچھ تاثرات اپنے بیسیوں کالموں میں وقتاً فوقتاً قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں، جبکہ اکثر حصہ ابھی ''در بطن شاعر'' کی کیفیت میں ہے۔

''الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ'' نے اس سال پندرہ روزہ فکری نشستوں میں میری گفتگو کا عنوان ''میری یادداشتیں'' طے کیا ہے جس کے تحت سال کے دوران ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مجالس میں اپنی جماعتی، مسلکی اور تحریکی سرگرمیوں کی یادداشتیں بشرط صحت و توفیق بیان کروں گا، اور انہیں ریکارڈ کرنے کے بعد قلمبند کرنے کا بھی پروگرام ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ میں نے اس میں ''جہاد افغانستان'' سے متعلقہ یادداشتوں کو ترجیحاً پہلے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہے، اس لیے کہ روس کے خلاف جہاد افغانستان کے آغاز سے طالبان حکومت کے خاتمہ تک بحمد اللہ تعالیٰ کم و بیش ہر مرحلہ میں شریک رہا ہوں، جس کے مشاہدات و تاثرات بلاشبہ قوم اور تاریخ کی امانت ہیں۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مجھے یہ امانت پوری دیانت اور شرح صدر کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ان گزارشات کے بعد امیر المومنین حضرت ملا محمد عمر مجاہدؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے رفقاء اور اہل خانہ کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور ان کے رفقاء و متوسلین کو صبر و حوصلہ کے ساتھ ان کا مشن جاری رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم اگست ۲۰۱۵ء)

(۲)

(۲۰۰۱ء میں افغانستان کے دورہ کے موقع پر ملا محمد عمر مجاہدؒ سے ملاقات کی مختصر روداد)

امیر المومنین ملا محمد عمر سے ہماری ملاقات منگل کے روز ہوئی، ہمارے میزبان ہمیں لے کر ان کی قیام گاہ پر پہنچے تو ان کی رہائش گاہ سے باہر کھلے میدان میں ننگی زمین پر کچھ علماء کرام دائرہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ دور سے دیکھ کر ہم نے سمجھا کہ شاید گھر کے اندر باری باری حضرات کو ملاقات کے لیے بلایا جا رہا ہے اور یہ حضرات اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہیں، لیکن جب قریب ہوئے تو دیکھا کہ ملا محمد عمر

بھی انہی لوگوں کے ساتھ خالی زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں پہلے بھی دیکھ رکھا تھا اس لیے پہچان لیا لیکن مجھے مولانا فداء الرحمان درخواستی کو یہ بتانا پڑا کہ یہ صاحب جنہوں نے درمیان سے اٹھ کر ہمارے ساتھ معانقہ کیا ہے یہی طالبان حکومت کے سربراہ امیر المومنین ملا محمد عمر ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر وہ حدیث یاد آگئی کہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے درمیان بے تکلفی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ باہر سے آنے والے کو بیٹھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہ دیکھ کر یہ پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ آج اس سنت کو اپنی آنکھوں کے سامنے زندہ ہوتے دیکھ کر جو خوشی ہوئی اسے الفاظ میں بیان کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

اس وقت افغانستان کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مولوی نور محمد ثاقب امیر المومنین کو عرب علماء کے وفد کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر رہے تھے۔ یہ گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا لیکن بعد میں ہمیں جو اس کا خلاصہ بتایا گیا اس کے مطابق ملا محمد عمر نے یہ کہا تھا کہ ان بتوں کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ ان کی عبادت نہیں ہوتی تھی اور یہ صرف نمائش اور یادگار کے طور پر تھے، اس لیے کہ عبادت صرف سامنے کھڑے ہو کر سر جھکانے کا نام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور ہستی یا چیز کے بارے میں دل میں تعظیم اور محبت کے وہ جذبات رکھنا بھی عبادت کے زمرے میں شامل ہے جو جذبات صرف خالق و مالک کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں، خواہ یہ تعظیمی جذبات رکھنے والا ہزاروں میل دور ہی کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اختیار حاصل ہو جانے کے بعد ہم نے ان بتوں کو توڑنے میں جو تاخیر کی ہے وہ ہماری کوتاہی ہے اور شاید اسی وجہ سے ہم بارش سے بھی مسلسل محروم چلے آرہے تھے اور پورے افغانستان میں طویل عرصہ کے بعد بارش کا نزول ہوا ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء)

جنرل حمید گل مرحوم

جنرل حمید گل مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی تاریخی جدوجہد اور تگ و دو کے

اثرات ایک عرصہ تک تاریخ کے صفحات پر جگمگاتے رہیں گے۔ ان کا تعلق پاک فوج سے تھا اور ان کا نام جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور جنرل اختر عبد الرحمان مرحوم کے ساتھ جہادِ افغانستان کے منصوبہ سازوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ جہاد افغانستان جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا اور جس کے مثبت و منفی دونوں قسم کے اثرات سے پوری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے یا انہیں بھگت رہی ہے۔

جنرل حمید گل مرحوم کا اس جنگ میں کیا کردار تھا؟ اس کے اظہار کا ایک پہلو یہ ہے کہ جہاد افغانستان کے نتیجے میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے جرمنی متحد ہوا اور برلن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والی دیوار توڑ دی گئی، تو زندہ دل جرمنوں نے اس کا ایک چھوٹا سا پتھر جنرل حمید گل مرحوم کو بھی اس نوٹ کے ساتھ بھجوایا کہ یہ دیوار چونکہ آپ کی کوششوں سے ٹوٹی ہے اس لیے یادگار اور اعتراف کے طور پر اس ٹوٹی ہوئی دیوار کا ایک پتھر آپ کو بھجوایا جا رہا ہے۔

جہاد افغانستان کی برکت سے نہ صرف جرمنی متحد ہوا بلکہ مشرقی یورپ کو کمیونزم کے تسلط سے نجات ملی، وسی ایشیا کی ریاستیں آزاد ہوئیں اور بالٹیک ریاستوں نے بھی آزادی کا ماحول پایا۔ مگر اسے تاریخ کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جہاد افغانستان میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والے افغان مجاہدین اپنے ہی ملک میں ایک بار پھر غیر ملکی جارحیت سے نبرد آزما ہیں اور ان کی مدد کے لیے دنیا بھر سے آئے ہوئے مجاہدین اپنے اپنے ملکوں میں ''دہشت گرد'' کا خطاب پا کر خود اپنی حکومتوں کے جبر کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کو جہاد افغانستان کے ہیروز میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ اگر صرف اسی اعزاز کو سینے سے لگائے دنیا سے رخصت ہو جاتے تو تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے کے لیے یہ بات کافی تھی۔ مگر ان کا ہدف صرف تاریخ میں اپنے نام کو محفوظ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ خود کو اللہ کا سپاہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جاں نثار، اسلام کا خدمت گزار، ملت اسلامیہ کا غم خوار اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظریاتی کارکن سمجھتے تھے۔ اس لیے زندہ دل جرمنوں سے ''خراج کا پتھر'' وصول کرنے کے بعد ان کے قدم رکے نہیں بلکہ وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور انہوں نے جہاد افغانستان کے نظریاتی مقاصد کے حصول، پاکستان کو ایک صحیح اسلامی ریاست کی شکل دینے اور عالم اسلام کی دینی تحریکات کے دفاع اور انہیں سپورٹ کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا اور اسی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے اللہ کے حضور جا

پہنچے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

انہیں جہاد افغانستان کا منصوبہ ساز کہا جاتا ہے اور اس کے بعد انہیں پاکستان میں اسلامی جمہوری اتحاد (IJI) کا خالق بھی بتایا جاتا ہے جبکہ افغانستان و پاکستان کے حوالہ سے بہت سی تحریکات کے راہ نماؤں میں وہ صف اول میں دیکھے جاتے رہے ہیں۔ ان کے طریق کار، سوچ اور اقدامات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا اسلام کی خاطر کیا، ملت اسلامیہ کا مفاد سمجھ کر کیا اور اسلامی جمہوری پاکستان کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ کیا۔

میں بھی چونکہ اسی راہ کا مسافر ہوں اور اس سفر میں صحرانوردی کرتے ہوئے مجھے نصف صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اس لیے جنرل حمید گل مرحوم کے ساتھ رفاقت، ہم آہنگی اور یگانگت فطری بات ہے اور یہ مختلف دائروں میں مسلسل رہی ہے۔ ملاقاتیں بھی رہی ہیں، مشاورت کا سلسلہ بھی وقفہ وقفہ سے موجود رہا ہے، متعدد تحریکات میں شرکت بھی رہی ہے، اور اہم قومی و دینی مسائل پر مشترکہ موقف کے اظہار کے لیے باہمی تبادلۂ خیالات کے مواقع بھی میسر رہے ہیں۔ جب اکوڑہ خٹک میں افغانستان اور پاکستان کے دفاع کے لیے قومی سطح پر دینی و سیاسی جماعتوں کا بہت بڑا کنونشن حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی صدارت میں ہوا تھا اور دفاع پاکستان و افغانستان کونسل کی تشکیل عمل میں لائی گئی تھی تو کنونشن کا موقف تحریر کرنے کی ذمہ داری جنرل حمید گل مرحوم اور راقم الحروف کو سونپی گئی تھی۔ ہم دونوں جب اس مقصد کے لیے تنہا ہوئے تو جنرل صاحب نے کہا کہ مولانا! آپ ہی لکھیں، میں اس پر نظر ثانی کر لوں گا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اس طرح اس کنونشن کا اعلامیہ مرتب کیا اور اس کی بنیاد پر ایک نئی قومی کونسل وجود میں آئی۔

جنرل صاحب آئی ایس آئی کے سربراہ تھے، انہیں اس منصب سے تبدیل کر کے جب ایک ٹیکنیکل قسم کا منصب دیا گیا تو وہ مستعفی ہو گئے۔ مجھے ان کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا اس لیے کہ سنیارٹی کی فہرست میں ایک دو ٹرم کے بعد ان کے چیف آف آرمی اسٹاف بننے کا چانس دکھائی دے رہا تھا۔ مگر وہ استعفیٰ دے چکے تھے اس لیے اب کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ تحریک انصاف ابھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ایم کیو ایم کے ساتھ ان کا کوئی مثبت تعلق نہیں تھا، جبکہ ان کے استعفیٰ پر سیاست کی اکاس بیل کا سایہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مستعفی ہوئے تو ہو ہی گئے البتہ بعد میں جب ہمارے خیال کے

مطابق اس ''چانس'' کا مرحلہ گزر گیا تو میں نے ایک ملاقات میں ان سے کہا کہ

''جنرل صاحب! اب آپ کو اپنے غصے پر غصہ تو آرہا ہوگا۔''

جنرل صاحب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ جرنل صاحب نظریاتی اور فکری دنیا کے بھی جنرل تھے۔ عالمی تاریخ اور بین الاقوامی معاملات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے، بروقت بات کہنے کا ذوق رکھتے تھے اور لگی لپٹی رکھے بغیر منہ پر بات کرنے کا حوصلہ بھی ان میں موجود تھا۔ لاہور کے فلیٹی ہوٹل میں ایک سیمینار تھا جس میں جسٹس سید نسیم حسن شاہ مرحوم نے قرآن و سنت کی بالادستی پر بڑی اچھی گفتگو کی۔ راقم الحروف بھی اس میں شریک تھا۔ جسٹس صاحب مرحوم کے بعد جب جنرل حمید گل مرحوم نے گفتگو کی تو جسٹس مرحوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ جناب والا! جب آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ''قرارداد مقاصد'' کو دستور کی بالادست دفعہ تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ تحریر فرما رہے تھے تو قرآن و سنت کی بالادستی پر آپ کا یہ عقیدہ کونسے فریزر میں منجمد پڑا تھا جس کا آپ نے آج کے خطاب میں اظہار کیا ہے؟ جنرل حمید گل مرحوم کے اس استفسار پر جسٹس صاحب مرحوم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور میرے دل نے بے ساختہ دعائیں دینا شروع کر دیں۔

جنرل حمید گل مرحوم کی جدائی سے ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی شناخت کے تحفظ اور ''اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام'' کی جدوجہد کے ایک عظیم جرنیل سے محروم ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبر و حوصلہ کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ اگست ۲۰۱۵ء)

اشتیاق احمد مرحوم

اشتیاق احمد مرحوم کے ساتھ زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں، دو تین بار کی ملاقات یاد ہے اور چند مضامین بھی نظر سے گزرے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر بچوں کے لیے لکھا ہے اور جب ان کی تصانیف اور مضامین کی شہرت ہوئی میں بچپن کی حدود سے بہت آگے جا چکا تھا۔ البتہ ان کے فن کی اہمیت و ضرورت سے ضرور آشنا رہا اور اسی وجہ سے ان سے محبت و انس کا تعلق رہا۔ وہ بنیادی طور پر جاسوسی

ادب کے دائرے کے ادیب تھے اور جاسوسی ادب سے ایک دور میں میرا بہت زیادہ رشتہ رہا ہے۔ طالب علمی کے دور میں سینکڑوں اور کم و بیش ہر صنف کے ناول پڑھے ہیں، مگر تاریخی اور جاسوسی ناولوں کو ہمیشہ ترجیحاً پڑھا ہے۔ جاسوسی ادب اپنے پڑھنے والوں کے ذہن پر کیا اثر ڈالتا ہے اور ان کی کون کون سی خفیہ صلاحیتوں اور احساسات و جذبات کو اجاگر کرتا ہے اس کے تجربے سے خود بھی گزر چکا ہوں اس لیے اشتیاق احمد کو دیکھ کر اور ان کی تحریرات کے متعلق جان کر خوشی ہوتی تھی کہ وہ ادب کے ایک اہم شعبے کو اس مہارت اور ذوق کے ساتھ نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے استعمال میں لا رہے ہیں اور ایک اہم دینی و ملی خدمت کی انجام دہی میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

ادب ابلاغ کا ایک اہم اور موثر ترین ذریعہ ہے اور ابلاغ کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن و قلوب پر اثر انداز ہونے اور جذبات و احساسات کا رخ موڑنے میں اس کا ہر دور میں اہم کردار رہا ہے۔ اس کی مختلف اصناف میں واقعات، کہانیوں، کہاوتوں، لطیفوں اور افسانہ و ناول کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ کہاوت اور قصے کی صنف تو قرآن مجید میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین عرب کا قرآن کریم پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ "ان ھذا الاساطیر الاولین" کہ یہ تو محض قصے کہانیوں کی کتاب ہے۔ قرآن مجید نے قصہ اور واقعہ کے علاوہ کہاوت کا بھی جابجا استعمال کیا ہے اور روایات میں صحابہ کرامؓ کی محافل میں قصوں، کہانیوں اور کہاوتوں کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔ اس دور میں عوامی واعظ کو القاص (قصہ گو) کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بخاری شریف میں دور صحابہ کے ایک قصہ گو حضرت نوف بکالی کا ذکر موجود ہے جنہوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اس واقعہ میں جن حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے وہ بنی اسرائیل والے رسول و نبی نہیں بلکہ کوئی اور بزرگ ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کی تردید کر دی۔ یہ نوف بکالی ایک عوامی واعظ اور قصہ گو کے طور پر متعارف تھے۔

بات سمجھانے کے لیے حقیقی واقعات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ فرضی کہانیوں کا اسلوب عام رہا ہے، جو مختصر ہو تو کہاوت کہلاتی ہے، قدرے طویل ہو تو اسے مقامہ یا افسانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور بہت لمبی ہو تو ناول کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہمارے ہاں درس نظامی میں "مقامات حریری" پڑھائی جاتی ہے جو اس دور کے افسانوں میں ہی شمار ہوتی ہے، اس میں اصلاحی باتیں فرضی واقعات کی صورت میں بیان کی گئی ہیں۔ جبکہ ہم نے اپنے چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمیدؒ سواتی سے مقامات

ہمدانی، کلیۃ ودمنہ، اخوان الصفا اور مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی العبرات سبقاً سبقاً پڑھی ہے جو فرضی کہانیوں کی طرز پر لکھی گئی تھیں اور حکمت و دانش سے بھرپور ہیں۔

قدیم دینی لٹریچر میں شعر و شاعری اور مقامہ و کہاوت کو تعلیم و تربیت کے ایک اہم ذریعے کی حیثیت حاصل رہی ہے مگر اب اس کا ذوق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ آج کے دور میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے شیخ محترم مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ مسلم معاشرے میں مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کی یلغار معاشرتی علوم اور ادب و صحافت کے راستوں سے ہوئی ہے، اس لیے اس کا راستہ روکنے کے لیے انہی علوم و فنون میں مہارت پیدا کرنا اور انہیں استعمال میں لانا ضروری ہے۔ جبکہ اس کی طرف ہمارے دینی تعلیمی نظام و نصاب کی منصوبہ سازی کرنے والوں کی سرے سے توجہ ہی نہیں ہے۔ ہم اگر ادب کچھ پڑھتے پڑھاتے ہیں تو وہ عصری تقاضوں اور معروضی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس کی ضرورت کا دائرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ قدیم دینی لٹریچر کے ساتھ تعلق قائم رہے اور ماضی سے ہمارا ادبی تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ یہ بھی ہماری بڑی ضرورت ہے لیکن اس سے عصری ضروریات اور معروضی ماحول سے مطابقت کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور سال ہا سال دینی مدارس میں تعلیم پا کر جب ایک فاضل عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو معاشرتی و ادبی فنون کے ماحول میں وہ اجنبی ہوتا ہے۔ جبکہ عصری ضروریات اس کے لیے صرف اجنبی نہیں ہوتیں بلکہ شجر ممنوعہ بن کر رہ جاتی ہیں۔

اس پس منظر میں اشتیاق احمد مرحوم کے ذوق و صلاحیت اور سعی و محنت کی قدر زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے ادب اور خاص طور پر جاسوسی ادب کو کامیابی کے ساتھ معاشرے کی اصلاح اور نئی نسل کی اخلاقی اور دینی تربیت کا ذریعہ بنایا اور اسی محنت میں زندگی بسر کر دی۔ میرے نزدیک اشتیاق احمد مرحوم کی زندگی میں ہمارے لیے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ کوئی بھی علم یا فن دینی حلقوں کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے بلکہ اسے صحیح طور پر اور صحیح رخ پر استعمال کیا جائے تو وہ دین کی دعوت، معاشرے کی اصلاح اور نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کا موثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اشتیاق احمد مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کی خدمات کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنا دیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲ دسمبر ۲۰۱۵ء)

غازی ممتاز قادری شہید

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا کہ بینا و بین اھل البدع الجنائز کہ ہمارے اور باطل پرستوں کے درمیان فیصلہ جنازوں پر ہوتا ہے۔ جبکہ خود ان کے جنازے میں لاکھوں افراد کی شرکت نے فیصلہ کر دیا تھا کہ امام احمد بن حنبلؒ اور ان پر کوڑے برسانے والوں میں سے کون حق پر تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ پر کوڑے برسانے والے بھی مسلمان ہی کہلاتے تھے اور امام موصوفؒ کو باغی اور واجب التعزیر قرار دینے پر دلائل رکھتے تھے، مگر امت مسلمہ نے نہ صرف اس وقت ان دلائل کو مسترد کر دیا تھا بلکہ آج تک ان خود ساختہ دلائل کو کوڑے دان سے نکال کر امت کے سامنے لانے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوا۔

غازی ممتاز قادری شہیدؒ کو پھانسی دینے پر بھی دلائل کی لائن لگی ہوئی ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں، لیکن اسلامیان پاکستان نے غازیؒ کے جنازے کو راولپنڈی اسلام آباد کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ بنا کر ان ساری توجیہات کو ہوا میں اڑا دیا ہے اور بتایا ہے کہ شرعی و قانونی دلائل و توجیہات اپنی جگہ مگر سول سوسائٹی اور رائے عامہ اسے شہید ہی سمجھتی ہے اور اسے خراج عقیدت پیش کرنے پر متفق و مجتمع ہے۔ البتہ مروجہ دانش کی اس چابکدستی کی داد دینا پڑتی ہے کہ اسے پینترے بدلنے میں خوب مہارت حاصل ہے، کیونکہ جب کسی مسئلہ پر شرعی تقاضوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے تو مروجہ دانش کی زبان و قلم پر سماجی ضروریات اور سوسائٹی کے رجحانات کی دہائی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر سماجی تقاضے اور سوسائٹی کے رجحانات ان اہل دانش کے ایجنڈے کی پیش رفت میں رکاوٹ بنتے ہیں تو انہیں قانونی موشگافیاں یاد آنے لگتی ہیں اور وہ شرعی و فقہی فروعات و جزئیات کا سہارا لینے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے۔

ریمنڈ ڈیوس کے کیس میں یہی ہوا تھا، اس نے پاکستان میں آکر کیا کیا گل کھلائے تھے؟ وہ کن لابیوں کے ساتھ کونسے مقاصد کے لیے سرگرم عمل تھا اور پاکستانی عوام کے جذبات و احساسات اس کے بارے میں کیا تھے؟ ہمارے ان دانشوروں کو یہ سب باتیں بھول گئی تھیں اور صرف یہ یاد رہ گیا تھا کہ اسلامی شریعت میں دیت کا بھی ایک قانون موجود ہے جس کا سہارا لے کر ریمنڈ ڈیوس کو نہ صرف قانون و شریعت کی زد میں آنے سے بچایا جا سکتا ہے بلکہ اس کے عزائم و جرائم پر پردہ بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور شریعت کے ایک قانون کی آڑ لے کر سول سوسائٹی کے جذبات و احساسات کا

خون کر دیا گیا۔ مگر ریمنڈ ڈیوس کو پھانسی سے بچانے والے آج غازی ممتاز قادریؒ کو پھانسی پر چڑھانے کے جواز میں قانون کی عملداری کی دہائی دینے میں مصروف ہیں۔ انہیں صرف یہ دکھائی دے رہا ہے کہ غازی ممتاز قادریؒ نے سلمان تاثیر کو قتل کرنے کے لیے قانون کو ہاتھ میں لیا تھا۔ یہ بات ان کے ذہن سے محو ہوگئی ہے کہ سلمان تاثیر نے جس دستور کی پاسداری کا حلف اٹھا کر گورنر کا منصب سنبھالا تھا اسی دستور کے تحت ایک جمہوری قانون کو کالا قانون قرار دے کر اپنے حلف کا کیا حشر کیا تھا۔ اور عدالت سے سزایافتہ ایک مجرمہ کے پاس جیل میں جا کر بلکہ وہاں پریس کانفرنس کر کے عدالتی فیصلوں کا کس طرح مذاق اڑایا تھا اور قانون کی بالادستی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

خدا خوش رکھے پاکستان کے زندہ دل مسلمانوں کو کہ انہوں نے سلمان تاثیر کے جنازے اور غازی ممتاز قادریؒ کے جنازے کی صورت میں اپنا یہ فیصلہ تاریخ میں رقم کر دیا ہے کہ ان میں قانون کو ہاتھ میں لینے والا کون تھا اور کس نے دستور و قانون کی روح کے تحفظ کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ ہماری مروجہ دانش کو صرف اپنے ایجنڈے کی فکر ہے جو خود اس کا اپنا نہیں ہے بلکہ اس کا ریموٹ کنٹرول کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ ریموٹ کنٹرول بھی اب خفیہ نہیں رہا بلکہ ساری دنیا کو دکھائی دے رہا ہے کہ کون کس کو کنٹرول کر رہا ہے اور کون کس کے ایجنڈے پر چل رہا ہے۔ اس دانش کو نہ دستور کی نظریاتی اساس سے کوئی دل چسپی ہے، نہ شریعت کے تقاضوں کی کوئی پروا ہے، اور نہ ہی سول سوسائٹی کے احساسات و جذبات اور رائے عامہ کا کوئی لحاظ ہے۔ اسے صرف اپنے ایجنڈے سے غرض ہے اور اس کے لیے مروجہ دانش اکثر اوقات جنگل کا شیر بن جاتی ہے کہ حسب موقع جی چاہے تو بچے دے اور جی چاہے تو انڈے دینا شروع کر دے۔

غازی ممتاز قادریؒ کو ملک بھر کی رائے عامہ اور سول سوسائٹی خراج عقیدت پیش کر رہی ہے جس کی سب سے بڑی دلیل میڈیا اور ذرائع ابلاغ پر وہ خفیہ کنٹرول ہے کہ اس کی کوئی خبر منظر عام پر نہ آنے پائے۔ چنانچہ جب لاکھوں کے اجتماعات میں شرکت کرنے والے لوگ رات کو ٹی وی چینلز اور صبح کو اخبارات دیکھتے ہیں تو انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اظہار رائے کا حق اور میڈیا کی آزادی ان کے لیے نہیں ہے۔ اور نہ ہی انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی بات کہہ سکیں اور پھر یہ توقع بھی رکھیں کہ ان کی آواز ''آزاد میڈیا'' کے اس دور میں ان کے دوسرے ہم وطنوں تک پہنچنی چاہیے۔

غازی ممتاز قادریؒ کے ساتھ میری عقیدت کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ جب عالمی قوتیں پاکستان میں ''صوفی اسلام'' اور ''مولوی اسلام'' کا فرق کھڑا کر کے بریلوی دیوبندی کشمکش کو ہوا دینے کی پلاننگ کر رہی تھیں، اس کی بریفنگ ''رینڈ کارپوریشن' کی تجزیاتی رپورٹ کی روشنی میں ''پینٹاگون'' میں دی جا رہی تھی، اور یہ کہا جا رہا تھا کہ دینی حوالہ سے مزاحمت اور جذباتیت کا ماحول صرف دیوبندیوں کے ہاں پایا جاتا ہے، اس لیے ''صوفی اسلام'' کے ذریعہ انہیں کارنر کر دیا جائے۔ اس فضا میں ممتاز قادریؒ نے قلندرانہ جرأت کا مظاہرہ کر کے دنیا کو باور کرایا کہ دینی حمیت اور مزاحمت کے جذبہ میں بریلوی بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں اور دینی حمیت وغیرت کو دیوبندیوں بریلویوں میں تقسیم کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ یہ منصوبہ فلاپ ہو گیا تھا اور اس کا ڈراپ سین اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ کی طرف سے کچھ لوگوں کے ساتھ چند ہزار ڈالروں کے لین دین کی بات کے اچانک انکشاف کی صورت میں سامنے آیا تھا۔

غازی ممتاز قادریؒ کی شہادت اور اس کے تاریخ ساز جنازے نے ''صوفی اسلام'' اور ''مولوی اسلام'' میں فرق کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی ہے اور وہ امت کی وحدت کی علامت بن کر دنیا سے رخصت ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ مارچ ۲۰۱۶ء)

مولانا مطیع الرحمان نظامی شہید

بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا مطیع الرحمان نظامی کو گزشتہ روز پھانسی دے دی گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کا قصور یہ دکھائی دے رہا تھا کہ

1. متحدہ پاکستان کے دور میں انہوں نے قیام پاکستان کے نظریاتی مقاصد کی تکمیل کی جدوجہد میں حصہ لیا اور وطن عزیز میں اسلامی احکام وقوانین کی عملداری کا مطالبہ کرتے رہے۔
2. پاکستان کی سالمیت ووحدت کے خلاف بھارتی دخل اندازی سامنے آئی تو وہ اپنے ملک اور اس کے دستور کی حمایت ودفاع اور وحدت وخود مختاری کے تحفظ کی جدوجہد کا حصہ بنے۔

3. انہوں نے ملک کی مسلمہ حکومت اور ملک کی حفاظت کرنے والی مسلح افواج کا ساتھ دیا اور بیرونی دخل اندازی کا مقابلہ کیا۔
4. جب وطن عزیز کی وحدت وسالمیت کی حفاظت میں قومی ادارے کامیاب نہ ہوسکے اور اس کے نتیجے میں ان کا علاقہ بنگلہ دیش کے نام سے ایک الگ اور خود مختار ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا تو انہوں نے اس زمینی حقیقت اور سیاسی تبدیلی کو قبول کر کے اور وطن کی وفاداری کا راستہ اپناتے ہوئے بنگلہ دیش کی شہریت اختیار کی اور اس کے دستور و قانون کی پاسداری کا حلف اٹھالیا۔
5. وہ نئے دستور کے تحت عام انتخابات میں اپنے ملک کی پارلیمنٹ کا دو دفعہ رکن بنے اور دوبار وزارت کے منصب پر بھی فائز ہوئے جس کے حوالہ سے ان کی دیانت و کارکردگی کو ہر سطح پر سراہا گیا۔
6. ملک میں مارشل لاء لگا تو ان کی جماعت جمہوریت کی بحالی کی جدوجہد میں حسینہ واجد کے ساتھ متحدہ محاذ کا حصہ بنی اور انہیں سپورٹ کیا۔

ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد انہیں چار عشرے قبل کے واقعات میں جنگی مجرم قرار دے کر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا ہے۔ جبکہ بنگلہ دیش کے قیام کے موقع پر پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کی حکومتوں کے درمیان باقاعدہ معاہدہ کے تحت اعلان کیا گیا تھا کہ گزشتہ کسی معاملہ میں کسی شخص کے خلاف کاروائی نہیں کی جائے گی۔

مولانا مطیع الرحمان کی پھانسی پر دنیا بھر میں احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے مذمت کی قرارداد منظور کی ہے اور ترکی نے احتجاج کے طور پر ڈھاکہ سے اپنا سفیر واپس بلا لیا ہے۔ مگر جمہوریت، دستور اور انصاف کی دہائی دینے والے بین الاقوامی ادارے اور عالمی قوتیں نہ صرف بنگلہ دیش بلکہ مصر و شام اور دیگر مسلم ممالک میں بھی عوامی جذبات اور امنگوں کو خون کا رنگ دینے والے اس مکروہ عمل پر خاموش ہیں، بلکہ درپردہ سپورٹ بھی کر رہی ہیں۔

گزشتہ روز مولانا عبدالرؤف ملک، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد اعوان، مخدوم منظور احمد تونسوی اور دیگر احباب کے ہمراہ منصورہ حاضری ہوئی اور ہم نے جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر جناب حافظ محمد

ادریس، صوبہ سندھ کے امیر جناب اسد اللہ بھٹو اور دیگر قائدین سے مولانا مطیع الرحمان نظامی کی مظلومانہ شہادت پر تعزیت اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور عالم اسلام میں ابتلاء و آزمائش سے دوچار تمام حضرات کو صبر و استقامت کے ساتھ سرخرو فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴ مئی ۲۰۱۶ء)

ملا اختر منصور شہید

امریکی ڈرون حملہ میں افغان طالبان کے امیر ملا اختر محمد منصور کی موت کی تصدیق سے پاکستان کے وزیر داخلہ چودھری نثار علی خان نے یہ کہہ کر گریز کیا ہے کہ جب تک ڈی این اے ٹیسٹ وغیرہ مکمل نہیں ہوتے اس خبر کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ لیکن مختلف بین الاقوامی ذرائع کے ساتھ ساتھ خود طالبان کے حلقوں میں نئے امیر کے انتخاب کے لیے نظر آنے والی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا منصور کی شہادت کا سانحہ رونما ہو چکا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جبکہ دوسری طرف امریکی صدر باراک اوبامہ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ دنیا میں کہیں بھی اپنے تحفظ کے لیے ڈرون حملوں کا حق رکھتا ہے اور ملا منصور شہیدؒ کو قتل کرنے سے اس کا مقصد افغان طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانا ہے۔

ملا اختر محمد منصورؒ کو طالبان کے بانی ملا محمد عمر مجاہدؒ کی وفات کے بعد افغان طالبان کا امیر منتخب کیا گیا تھا۔ جبکہ نئی صورتحال میں ان کے جانشین کے طور پر ملا محمد عمرؒ کے فرزند ملا محمد یعقوبؒ اور مولانا جلال الدین حقانی کے فرزند سراج الدین حقانی کا نام نمایاں طور پر لیا جا رہا ہے اور مختلف تبصرے سامنے آرہے ہیں۔ جبکہ اس سلسلہ میں مکمل اور صحیح صورتحال سامنے آنے میں شاید ابھی وقت لگے گا۔

یہ بات کم و بیش واضح ہے کہ امریکہ افغان طالبان کو اپنے ایجنڈے پر لانے میں قوت کے بھرپور استعمال کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکا۔ چنانچہ ان کے امیر کو مبینہ طور پر قتل کر دینے کے بعد بھی وہ اسے اپنی کامیابی قرار دینے کا حوصلہ نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان مارک ٹونر نے اپنی ایک حالیہ بریفنگ میں کہا ہے کہ

"یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حملہ کے بعد طالبان کو شکست ہوگئی ہے۔"

افغان طالبان دراصل روسی جارحیت کے خلاف جہاد افغانستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والے ان عناصر پر مشتمل ہیں جنہوں نے سوویت یونین کی واپسی کے بعد اس خطہ میں نئے امریکی ایجنڈے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ جبکہ امریکہ کی خواہش اور کوشش تب سے یہی ہے کہ اس نے دنیا کی "یک قطبی چودھراہٹ" اور نئی علاقائی تقسیموں کے لیے جو ایجنڈا طے کر رکھا ہے، جہاد افغانستان میں حصہ لینے والے تمام عناصر اس کے کسی نہ کسی خانے میں فٹ ہو جائیں اور اس ایجنڈے کی تکمیل میں کردار ادا کریں یا کم از کم اس میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بہت سے گروہ اس کے بعد سے اس ایجنڈے کا حصہ بن چکے ہیں جن کی سرگرمیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ استفادہ کر رہا ہے۔

افغان طالبان اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور وہ افغانستان کی مکمل خود مختاری کے ساتھ جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کی تکمیل کے عزم پر بدستور قائم ہیں۔ یہ دونوں باتیں نئے عالمی امریکی ایجنڈے سے مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ عالمی حلقوں میں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار نظریاتی اسلامی ریاست نہ صرف دنیا میں استعماری عزائم کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے بلکہ پورے عالم اسلام میں خود مختاری اور اسلامیت کے جذبات کے فروغ کا ذریعہ بھی ثابت ہوگی۔ اسی لیے عسکری کاروائی کے ذریعہ افغان طالبان کی حکومت کو ختم کیا گیا اور امریکی اتحاد کی مسلح یلغار کے ذریعہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کی مسلسل کاروائیاں جاری ہیں۔ مگر افغان طالبان اپنے اس موقف پر قائم ہیں کہ اگر افغانستان پر روسی عسکریت ناجائز تھی تو امریکی اتحاد کی عسکری یلغار بھی ملک کی خود مختاری کے منافی اور ناجائز ہے۔ اور وہ روس کی طرح امریکی عسکری جارحیت کا سامنا بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے تحفظ اور قومی خود مختاری کی بحالی کے لیے کر رہے ہیں۔

یہ بات اب بحث طلب نہیں رہی کہ امریکی اتحاد عسکری قوت اور عالمی سطح پر کردار کشی کی وسیع تر مہم کے باوجود اور بہت سے عسکری گروہوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اپنے ایجنڈے کا حصہ بنا چکنے کے بعد بھی افغان طالبان کو اپنے ڈھب پر نہیں لا سکا اور نہ ہی انہیں قوت کے ذریعے ختم کر دینے میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ یہ مقاصد اب مذاکرات کی میز پر حاصل کرنا چاہتا ہے اور افغان

طالبان کے اصولی موقف کی پروا کیے بغیر انہیں زبردستی مذاکرات کی میز پر لانے کے لیے اس قدر بے چین ہے کہ اس کے لیے ڈرون حملوں کے ذریعہ پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کو داؤ پر لگا دینے میں بھی اسے کوئی حجاب نہیں ہے۔ امریکی صدر کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کسی آزاد اور خود مختار ملک کے اندر ڈرون حملے اس کی سالمیت اور خود مختاری کے منافی ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ افغان طالبان محض ایک عسکری گروہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی قوت ہے جس کی بنیاد اسلام پر بے لچک عقیدہ وایمان کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کی مکمل خود مختاری اور آزادی پر ہے جو انسانی حقوق کے اس نام نہاد چارٹر کا بھی تقاضہ ہے جسے امریکی اتحاد نے دنیا بھر میں اپنے تسلط و اقتدار کے لیے ہتھیار بلکہ کھلونا بنا رکھا ہے۔

امریکیوں کی غرض اب صرف یہ رہ گئی ہے کہ جو وہ چاہ رہے ہیں وہ کیوں نہیں ہو پا رہا ہے اور دنیا کے مستقبل کا جو نقشہ انہوں نے طے کر رکھا ہے کچھ لوگ امریکہ کے فریب کا شکار ہو کر اس میں فٹ ہونے سے انکار کیوں کر رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں افغان طالبان نے بامقصد مذاکرات سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی اب انہیں اس کا مورد الزام قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر مذاکرات کا مقصد ان سے اپنی مرضی کی کسی دستاویز پر دستخط لینا ہے تو وہ شاید اس کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے اور نہ ہی انہیں اس کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ملا اختر محمد منصورؒ کی شہادت نے دنیا کو ایک بار پھر یہ واضح پیغام دیا ہے کہ خود مختاری افغانستان کا حق ہے اور اسلام افغان قوم کا مستقبل ہے جس سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام۔ ۲۶ مئی ۲۰۱۶ء)

عبد الستار ایدھی مرحوم

عبد الستار ایدھی بھی ہم سے رخصت ہو گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھے اور نوے برس سے زیادہ عمر پا کر انہوں نے اس عالم رنگ و بو کو خیرباد کہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے سماجی خدمت کے کام کا آغاز کیا اور ۲۰۱۵ء تک مسلسل متحرک رہے۔ اس طرح ان کی سماجی

خدمات کا دورانیہ پینسٹھ سال کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے مشن کے لیے ہمیشہ متحرک رہتے تھے اور کسی صلہ و ستائش کی تمنا دل میں سجائے بغیر اور کوئی امتیاز روا رکھے بغیر معاشرے کے معذور، نادار اور بے سہارا لوگوں کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں سینکڑوں اعزازات اور تمغوں سے نوازا گیا مگر کوئی بڑے سے بڑا اعزاز بھی ان کے مزاج میں تبدیلی نہ لا سکا۔ حتیٰ کہ صدر ضیاء الحق مرحوم نے انہیں وفاقی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا تو یہ رکنیت بھی انہیں راس نہ آئی اور وہ زیادہ دن اس کا بار نہیں اٹھا سکے۔

عبد الستار ایدھی مرحوم کی زندگی سماجی خدمت سے عبارت تھی۔ خدمت، خدمت اور خدمت ان کا واحد مقصد تھا۔ وہ اسی کے لیے جیے اور اسی راہ میں چلتے چلتے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ وہ نہ تو پڑھے لکھوں میں شمار ہوتے تھے اور نہ ہی مال و دولت میں ایک عام شخص سے زیادہ کوئی مقام رکھتے تھے۔ انہیں ان کی داڑھی اور سادگی کے باعث مولانا ایدھی کہہ دیا جاتا تھا لیکن وہ نماز روزے کی واجبی تعلیم سے زیادہ دین کا علم نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انہیں اس کا دعویٰ تھا۔ بلکہ وہ اپنی بے علمی اور سادگی کے باعث بعض ایسی باتیں بھی کہہ جاتے تھے جو اہل دین کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھیں، لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے انہوں نے کبھی ایسی کسی بات پر اصرار نہیں کیا۔

ایک موقع پر عبد الستار ایدھی مرحوم نے ملک کو خیرباد کہہ کر ترک وطن کے ارادے کا اظہار کیا تو میں بھی ان سے اس پر نظر ثانی کی درخواست کرنے والوں میں شامل تھا۔ میں نے اپنے ایک کالم میں اس کے لیے اسلامی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کا حوالہ دیا تھا کہ جب مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر سفر پر روانہ ہو گئے تو راستہ میں برک الغماد کے مقام پر بنو قارہ قبیلہ کے سردار ابن الدغنہ نے انہیں روک کر پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت ابوبکرؓ نے بتایا کہ مکہ والے اب تو آزادی کے ساتھ عبادت بھی نہیں کرنے دیتے اس لیے یہ جگہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جہاں کھلا ماحول ملا وہیں بس جاؤں گا۔ بنو قارہ قبیلے نے اس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور ابن الدغنہ بھی کافر سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا مثلک لا یخرج ولا یخرج کہ تمہارے جیسے لوگ شہر چھوڑ کر نہیں جایا کرتے اور نہ ہی انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تم معذوروں کی

خدمت کرتے ہو، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہو، محتاجوں کو کما کر کھلاتے ہو، مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہو، اور ناگہانی آفتوں میں لوگوں کے خدمت گزار بنتے ہو۔ بنو قارہ کا یہ سردار حضرت ابوبکرؓ کو اپنی ضمانت پر واپس مکہ مکرمہ لایا اور مکہ مکرمہ کے سرداروں سے الگ الگ مل کر انہیں احساس دلایا کہ تم ایک ایسے شخص کو شہر چھوڑ جانے پر کیوں مجبور کر رہے ہو جو سماجی خدمت گزار ہے اور معاشرہ کے نادار اور معذور لوگوں کا سہارا بنتا ہے۔

عبدالستار ایدھی کی سماجی خدمات کی جولانگاہ پورا ملک تھا اور غریب عوام کا ہر طبقہ ان سے مسلسل مستفید ہو رہا ہے۔ ابھی اسی رمضان المبارک کے دوران میں نے انیق احمد صاحب کے پروگرام ''روح رمضان'' کی کراچی ایدھی شیلٹر ہوم میں منعقد ہونے والی نشست میں شرکت کی ہے جہاں اولاد کی بے توجہی بلکہ بے وفائی کا شکار ہونے والے بوڑھے باپوں اور ماؤں کا جو حال دیکھا ہے اس نے ایدھی مرحوم اور ان کے بے لوث کام کی اہمیت کو دل میں اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ یہ کام اصل میں ریاست و حکومت کے کرنے کا ہے اور اسلام میں بیت المال کا بنیادی تصور یہی ہے کہ سوسائٹی کے کمزور، نادار، معذور، بے سہارا، اور بے روزگار افراد کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے خلافت راشدہ کے دور بالخصوص حضرت عمرؓ کے رفاہی سسٹم کو آج تک آئیڈیل سمجھا جاتا ہے اور بہت سی غیر مسلم حکومتیں کسی حد تک اسے اپنائے ہوئے بھی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے قومی دولت کا بڑا حصہ ملک و قوم اور غریب عوام کے کام آنے کی بجائے مغربی ملکوں کے بینکوں اور پانامہ لیکس کی آف شور کمپنیوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ جبکہ غریب عوام کا حال یہ ہے کہ اس عید پر بچوں کو عید کی خوشیاں فراہم نہ کر سکنے پر خودکشی کرنے والوں کی تعداد کو شمار کیا جائے تو پانامہ لیکس کی آڑ میں ایک دوسرے کے اثاثوں اور آف شور کمپنیوں کا شور مچانے والے سیاستدانوں کی انسانیت کا کسی امتیاز کے بغیر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس ماحول اور فضا میں عبدالستار ایدھی کی سماجی خدمات کو دیکھ کر دل کو تسلی ہوتی ہے کہ ابھی انسانیت کا جذبہ اور خدمت کا ذوق فنا نہیں ہوا۔ سماجی خدمات سرانجام دینے والی شخصیات اور ادارے اور بھی بہت سے ہیں جو بلاشبہ سب کے سب تحسین و تبریک کے مستحق ہیں لیکن ایدھی مرحوم کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے سماجی خدمت کو اپنے وقت، صلاحیت اور مال کا مختصر حصہ نہیں دیا بلکہ اپنا سب کچھ اس کے

لیے نچھاور کر دیا اور ''فنافی الخدمت'' ہوگئے۔ انہوں نے اپنے نفس کو مٹا دیا اور صلہ وستائش کی ہر تمنا سے بے نیاز ہوگئے۔

بلاشبہ عبدالستار ایدھی ہمارا ملی اثاثہ اور قومی ہیرو تھے اور سوسائٹی کے خدمت گزاروں کے لیے ''رول ماڈل'' کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم ان کے خاندان، رفقاء کار اور ان کے نیٹ ورک کے تمام ارکان کے اس غم میں شریک ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ان کا قائم کردہ سماجی خدمت کا یہ نظام بدستور کام کرتا رہے گا اور اسے پہلے سے زیادہ کارکنوں کی توجہ کے ساتھ قوم کا تعاون بھی مسلسل حاصل رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ایدھی مرحوم کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں اور ان کے سماجی خدمت کے جذبہ کو سب کے لیے مثال بنادیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۲ جولائی ۲۰۱۶ء)

جنید جمشید شہید

جنید جمشید شہید اپنے دوستوں اور ماحول سے رخصت ہوکر اللہ رب العزت کے حضور پیش ہو چکے ہیں مگر ان کی یاد اور تذکرہ کسی نہ کسی حوالہ سے مسلسل چل رہا ہے۔ طیارہ کے حادثہ میں جاں بحق ہونے والے شہداء کا غم قومی سطح پر منایا گیا ہے، وہ سب ہمارا قیمتی سرمایہ تھے اور ان سب کے لیے پوری قوم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہے کہ اللہ رب العزت ان کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائیں اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

جنید جمشید مرحوم کی جدائی کا غم جس طرح ہر طبقہ اور ہر سطح پر محسوس کیا گیا ہے اس کا رنگ ہی جدا ہے۔ دراصل یہ جنید جمشید نامی ایک شخص کو خراج عقیدت نہیں ہے بلکہ اس کردار اور طرز عمل کی پذیرائی ہے جس کے باعث جنید جمشید نے لاکھوں مداحوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اس کردار اور طرز عمل کو مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عیش وعشرت ترک کر کے اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع، اس رجوع کے لیے خود آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی دعوت دینے اور مخلوقِ خدا کو خدا کے دروازے پر واپس لانے کا عمل ہے۔ انسان کی فطرتِ سلیمہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی عیش وعشرت میں جس قدر بھی آگے بڑھ جائے اس کے دل کے اندر کہیں نہ کہیں وہ تار موجود

ہوتا ہے جسے اگر بروقت اور سلیقے سے چھیڑ دیا جائے تو انسان کا ضمیر بیدار ہوتا ہے اور اسے اپنے خالق و مالک کی طرف واپس لوٹنے کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔

جنید جمشیدؒ نے ایک مقبول گلوکار سے دین کے ایک فکر مند داعی کے مقام کی طرف جو سفر کیا اسے دیکھ کر امت کے عظیم علمی و روحانی بزرگ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو اتباع تابعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ حضرت امام بخاریؒ کے استاذ گرامی اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مایۂ ناز شاگرد تھے اور علمی دنیا میں انہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں تاریخ کے صفحات یہ بتاتے ہیں کہ نوجوانی کے دور میں وہ موسیقی اور ناچ گانے کی محفلوں کے دلدادہ تھے، ان کے شب و روز اپنے جیسے دوستوں کے ہمراہ اسی قسم کی سرگرمیوں میں گزرتے تھے، اور بے تکلف دوستوں کا یہ طائفہ اکثر اوقات ناچ گانے کے ماحول میں مگن رہتا تھا۔ عبد اللہ بن مبارکؒ بتاتے ہیں کہ ایک روز کسی باغ میں اسی طرح کی محفل بپا تھی اور وہ دوستوں کے ساتھ خاصی دیر تک ان مشاغل میں مگن رہنے کے بعد سو گئے۔ خواب میں انہوں نے دیکھا کہ باغ کے ایک درخت پر خوبصورت سی چڑیا بیٹھی ہے اور مترنم آواز میں قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ رہی ہے الم یان للذین اٰمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق (سورۃ الحدید۔ آیت ۱۶) کہ کیا ابھی ایمان والوں پر وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے نازل کردہ احکام کی طرف جھک جائیں؟ جب ان کی آنکھ کھلی تو ان کی زبان پر اس جملہ کا تکرار تھا کہ وہ وقت آگیا ہے، وہ وقت آگیا ہے۔

اس پر حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دین اور علم دین کی طرف آگئے۔ اور پھر انہوں نے علم، روحانیت اور جہاد کے محاذوں پر وہ خدمات سرانجام دیں کہ انہیں اتباع تابعین کے پورے طبقے کا امام کہا جاتا ہے اور "امیر المومنین فی الحدیث" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام سفیان ثوریؒ کی مجلس اختیار کی اور علم حدیث کے بڑے ائمہ میں شما رہونے لگے۔ رقص و سرود کی محفلوں کا رسیا شخص علم حدیث کے ماحول میں ایسا گم ہوا کہ ایک دن کسی دوست نے پوچھ لیا کہ آپ اس تنہائی سے بور نہیں ہوتے؟ جواب دیا کہ میں تنہا کب ہوتا ہوں، میں تو ہر وقت جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ماحول میں ہوتا ہوں اور میری گفتگو حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت ابو

موسیٰ اشعریؓ جیسے بزرگوں سے ہر وقت ہوتی رہتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا دور تو بہت پرانا ہے ہم نے حال ہی میں حق کی طرف رجوع کرنے والی ایک اور شخصیت کو دیکھا ہے جسے دنیا "یوسف اسلام" کے نام سے جانتی ہے۔ وہ پاپ سنگر تھے اور موسیقی کی دنیا میں بڑا نام رکھتے تھے مگر جونہی اسلام قبول کیا ذہن و قلب کا رخ دین کی خدمت اور دعوت کے میدان کی طرف پھر گیا۔ میری ان سے پہلی ملاقات ڈیوزبری برطانیہ کے تبلیغی مرکز میں ایک بڑے تبلیغی اجتماع کے دوران ہوئی تھی۔ جبکہ بعد میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا مفتی محمد عیسیٰ منصوری کے ہمراہ میں نے لندن میں یوسف کے اسلامک سکول کا وزٹ بھی کیا۔ وہ دین کی دعوت اور تعلیم دونوں میدانوں میں مسلسل سرگرم عمل رہتے ہیں اور برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی نئی نسل کو دین اور دینی اقدار کے ساتھ وابستہ رکھنا ان کا سب سے بڑا مشن بن گیا ہے۔

جنید جمشید اسی صف کے لوگوں میں سے تھے، جب زندگی کا رخ بدلا تو حمد و نعت کے ساتھ ساتھ دعوتِ دین کی محنت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی، حتیٰ کہ اپنے آخری سفر میں چترال کے تبلیغی مرکز میں اسی خدمت کو سرانجام دینے کے بعد وہ اس طیارے پر سوار ہوگئے جو ان کے لیے اپنے رب کی بارگاہ میں حضوری کا پروانہ ثابت ہوا۔ جنید جمشید کی جدائی پر وسیع پیمانے پر محسوس کیا جانے والا یہ غم دراصل ہمارے اس قومی اور معاشرتی جذبہ و احساس کا عکاس ہے کہ اپنے اللہ کی طرف رجوع، عیش و عشرت کے ماحول سے واپسی، اور آخرت کی تیاری کے لیے ہر مسلمان کے دل میں تڑپ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور موجود ہے۔ اس تڑپ کو بے ثبات دنیا کی رنگا رنگ آسائشوں نے گھیر رکھا ہے، اسے صرف صحیح راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، یہ کام اگر سلیقے سے کیا جا سکے تو جنید جمشید کا غم محسوس کرنے والے لاکھوں افراد خود بھی جنید جمشید بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ طیارے کے حادثہ کے تمام شہداء کو جنید جمشید شہید سمیت جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں اور ان کے پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ انصاف، لاہور۔ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۶ء)

مولانا جلال الدین حقانیؒ

مولانا جلال الدین حقانیؒ کی وفات کی خبر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی گہرے صدمہ کا باعث بنی ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون، اور اس کے ساتھ ہی جہاد افغانستان کے مختلف مراحل نگاہوں کے سامنے گھوم گئے ہیں۔ مولانا جلال الدین حقانیؒ جہاد افغانستان کے ان معماروں میں سے تھے جنہوں نے انتہائی صبر و حوصلہ اور عزم و استقامت کے ساتھ نہ صرف افغان قوم کو سوویت یونین کی مسلح جارحیت کے خلاف صف آرا کیا بلکہ دنیا کے مختلف حصوں سے افغان جہاد میں شرکت کے لیے آنے والے نوجوانوں اور مجاہدین کی سرپرستی کی اور انہیں تربیت و حوصلہ کے ساتھ بہرہ ور کر کے عالم اسلام میں جذبۂ جہاد کی نئی روح پھونک دی۔ ان کا وہ دور ہمیں یاد ہے جب وہ انتہائی بے سروسامانی اور کسمپرسی کے عالم میں سوویت یونین کی مسلح فوجوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور سوویت یونین کے مخالفین ابھی صرف تماشہ ہی دیکھ رہے تھے، انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ خدامست لوگ آخر کس طرح دنیا کی ایک بڑی فوجی قوت کے خلاف اپنی مزاحمت کو جاری رکھ سکیں گے۔ مگر مولوی جلال الدین حقانی، پروفیسر صبغت اللہ مجددی، سید احمد گیلانی، مولوی محمد نبی محمدی، مولوی محمد یونس خالص، مولوی ارسلان رحمانی، کمانڈر احمد شاہ مسعود، انجینئر حکمت یار رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان جیسے دیگر باہمت لوگوں نے صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کی وہ روایات زندہ کر دیں جن کے تذکرے ہم اسلامی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔

سالہا سال تک یہ کیفیت رہی کہ پرانے ہتھیاروں اور خود ساختہ دیسی بموں کے ساتھ وہ روسی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے، بوتلوں میں خاص قسم کے محلول بھر کر انہیں بموں کے طور پر روسی ٹینکوں کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا اور گوریلا جنگ میں ان مجاہدین نے افغانستان کے دیہی علاقوں میں روسی افواج کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ شیرانوالہ لاہور میں ہمارے ایک بزرگ مولانا حمید الرحمان عباسیؒ کا مستقل کام یہ تھا کہ اصحاب خیر کو توجہ دلا کر ان مجاہدین کے لیے خوراک اور دیگر ضروریات جمع کرتے رہتے اور جب ایک ٹرک کے لگ بھگ سامان جمع ہو جاتا تو خوست کے محاذ پر سپلائی کر دیا کرتے تھے، اسی طرح پاکستان کے بہت سے شہروں کے علماء اور مخیر حضرات مجاہدین افغانستان کی امداد کیا کرتے تھے۔ اس دور میں خوست کے محاذ پر جانے والے چند نوجوانوں نے ہمیں

بتایا کہ کئی کئی روز تک سادہ روٹی گڑ اور پیاز کے ساتھ کھانے کو ملتی تھی اور فقر و فاقہ کے ماحول میں وہ مصروف جہاد رہتے تھے۔ امریکہ اور دیگر عالمی طاقتیں یہ دیکھ کر بہت بعد میں اس طرف متوجہ ہوئیں کہ افغانستان کا ایک بڑا حصہ ان مجاہدین کے مختلف گروپوں کے زیر تسلط آگیا ہے اور روسی فوجوں کی پشت پناہی کے باوجود کابل حکومت کا کنٹرول چند بڑے شہروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ جب مغربی ملکوں کو ان مجاہدین کی مسلح مزاحمت کی سنجیدگی کا اندازہ ہوا تو وہ اس میں اپنا حصہ ڈالنے بلکہ ہمارے خیال میں اپنا ''لچ'' تلنے کے لیے میدان میں کود پڑے۔ پھر اسلحہ، دولت اور وسائل کی ریل پیل ہوگئی اور اسی گہما گہمی میں امریکی کیمپ نے افغان جہاد کو ہائی جیک کر کے اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔ ہم نے دونوں دور آنکھوں سے دیکھے ہیں، وہ دور بھی جب فقر و فاقہ اور خدا مستی کا ماحول تھا اور وہ دور بھی جب وسائل اور اسباب کی فراوانی تھی، دونوں میں بڑا فرق تھا مگر خدا شاہد ہے کہ جن حضرات نے اس فرق سے ذرہ بھر اثر نہیں لیا اور جن کے خلوص و جذبہ میں دولت و اسباب کی فراوانی کوئی تبدیلی نہ لا سکی ان میں مولانا جلال الدین حقانیؒ سرفہرست تھے۔

جہاد افغانستان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جب تک اس کا رخ سوویت یونین کی طرف تھا اور یہ لوگ امریکہ بہادر کے عالمی حریف کے خلاف نبرد آزما تھے، وہ مجاہدین کہلاتے تھے، وائٹ ہاؤس ان کا خیر مقدم کرتا تھا اور امریکی کیمپ کے مسلم ممالک بھی ان کی راہوں میں دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد افغانستان کے دینی تشخص کی بحالی اور نظام شریعت کے نفاذ کو اپنی منزل قرار دیا تو وہ دہشت گرد قرار پائے اور ان کا سب سے بڑا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ افغانستان کو ہر قسم کی غیر ملکی مداخلت سے پاک ایک خود مختار ریاست بنانے کی بات کر رہے ہیں، افغانستان کی قومی و تہذیبی روایات کے تحفظ کی بات کر رہے ہیں اور اپنے ملک میں شریعت کے نظام کے نفاذ کی بات کر رہے ہیں۔ یہ تینوں باتیں آج کی دنیا میں کسی بھی مسلمان ملک کے لیے جرائم کا درجہ رکھتی ہیں، خود ہمارے ہاں پاکستان میں ان تینوں باتوں پر اصرار کرنے والے لوگ دہشت گرد یا کم از کم شدت پسند کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔

مولانا جلال الدین حقانیؒ کا یہ بھی ''قصور'' تھا کہ انہوں نے جس طرح افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی جارحیت کو افغانستان کی آزادی پر حملہ تصور کر کے اس کے خلاف مزاحمت کی اور روسی کمیونزم

کے نفوذ کو افغانستان کے اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کے منافی قرار دے کر اسے مسترد کر دیا، اسی طرح وہ افغانستان میں امریکی اتحاد کی افواج کی موجودگی اور مغربی فلسفہ و نظام کے تسلط کو بھی افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے وہ سوویت یونین کی فوجوں کی طرح امریکی اتحاد کی فوجوں کے خلاف بھی صف آرا ہو گئے اور اپنے اس موقف پر آخر دم تک قائم رہے۔ انہوں نے امارت اسلامی افغانستان کا ساتھ دیا اور اس کے لیے مسلسل محنت کی، آج ان کی محنت اور جدوجہد کا ثمرہ ہے کہ امریکہ افغان طالبان سے مذاکرات کی میز پر آنے کا مطالبہ کر رہا ہے اور اس کے لیے ہر جتن کر رہا ہے مگر افغان طالبان جن کے پاس خود امریکی حلقوں کی رپورٹوں کے مطابق افغانستان کے بیشتر علاقوں کا کنٹرول ہے، مذاکرات کی میز سجانے سے پہلے افغانستان سے امریکہ کے مکمل انخلا کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ افغانستان کی آج کی معروضی صورتحال اور زمینی حقائق اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ افغانستان کی مکمل خود مختاری، غیر ملکی مداخلت سے نجات اور نفاذ شریعت کی جنگ لڑنے والے اس جنگ کی طوالت سے خوفزدہ نہیں ہیں کیونکہ جنگیں ان لوگوں کی سرشت میں داخل ہیں، البتہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں مولانا جلال الدین حقانیؒ ان سے جدا ہو گئے ہیں جو بلاشبہ بہت بڑا صدمہ ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور افغان قوم کو ان کے مشن اور جذبات کے مطابق مکمل خود مختاری سے بہرہ ور فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اس کے ساتھ ایک اور خبر ہمارے خاندان اور متعلقہ دینی حلقوں کے لیے صدمہ کا باعث بنی ہے کہ جمیعۃ علماء برطانیہ کے راہنما اور جامع مسجد برنلی مانچسٹر کے خطیب مولانا عزیز الحق ہزاروی گزشتہ روز راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ہماری بڑی ہمشیرہ کے داماد اور جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل تھے۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور اہل خاندان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۶ ستمبر ۲۰۱۸ء)

پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ

گزشتہ روز ایک قومی اخبار کے آخری صفحہ پر مختصر سی خبر نظر سے گزری کہ افغانستان کے سابق صدر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ ۹۳ برس کی عمر میں کابل میں انتقال کر گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر نے ذہن میں ماضی کے بہت سے یادگار مناظر ایک ایک کر کے تازہ کر دیے اور دل سے بے ساختہ مجددی صاحب مرحوم کے لیے مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا نکلی، اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

پروفیسر صاحب مرحوم کا تعلق کابل کے معروف روحانی خانوادہ سے تھا اور وہ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی بزرگ شخصیات میں سے تھے۔ سوویت یونین کے خلاف افغان عوام کے جہاد آزادی میں مجاہدین کے ایک مستقل گروہ کے سربراہ تھے اور جہاد افغانستان کے دوران ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مسلسل متحرک رہے۔ میری ان سے ذاتی نیاز مندی تھی اور باہمی رابطہ و تعلق بھی رہا۔ وہ ایک بار ہماری دعوت پر گوجرانوالہ تشریف لائے، مرکزی جامع مسجد میں جمعۃ المبارک کے اجتماع سے خطاب کیا اور ایک میڈیکل کلینک کا افتتاح کرنے کے علاوہ اپنے اعزاز میں دیے گئے بھرپور استقبالیہ میں جہاد افغانستان کے مقاصد اور مجاہدین کی سرگرمیوں کے حوالہ سے تفصیلی گفتگو کی۔

یہ ایک بزرگ شخصیت کے طور پر پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ کا اعزاز تھا کہ افغانستان سے سوویت یونین کے انخلا کے بعد ملک کا نظم ونسق چلانے کے لیے جو عبوری حکومت متفقہ طور پر قائم ہوئی اس کا سربراہ انہیں چنا گیا اور انہوں نے صدر کی حیثیت سے افغانستان کا اقتدار سنبھالا۔ یہ عبوری حکومت چھ ماہ کے لیے ایک معاہدہ کے تحت قائم ہوئی تھی، اس دوران کچھ حضرات نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ ایک اسلامی ریاست کے امیر منتخب ہو گئے ہیں اس لیے انہیں اب اس منصب پر فائز رہنا چاہیے اور مدت گزرنے کے بعد اقتدار کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ اس موقع پر انہوں نے پاکستان سے اپنے دوست اور بہی خواہ سرکردہ علماء کرام کو مشاورت کے لیے کابل بلایا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ایوان صدر میں ان کی زیر صدارت طویل مشاورتی اجلاس ہوا جس میں ان سے یہ کہا گیا کہ امیر زندگی بھر کے لیے ہوتا ہے اس لیے وہ خود کو چھ ماہ کی مدت تک محدود نہ رکھیں۔ جبکہ ہم چند دوستوں نے یہ عرض کیا کہ انہیں معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے اور مدت پوری

ہوتے ہی اقتدار اس حکومت کے لیے چھوڑ دینا چاہیے جو باہمی اتفاق سے قائم ہو جائے۔ میں نے اس مجلس میں ان سے گزارش کی کہ ایک بزرگ اور محترم شخصیت کے طور پر ان کے لیے تاریخ میں یہ اعزاز کچھ کم نہیں ہے کہ سوویت یونین کی فوجوں کے انخلا کے بعد متفقہ آزاد حکومت کا سربراہ انہیں چنا گیا ہے اور انہیں اپنے اعزاز کو متنازعہ نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے ہمارے اس مشورہ کو قبول فرمایا اور مدت گزرتے ہی اقتدار نئے فیصلے کے مطابق پروفیسر برہان الدین ربانیؒ کے حوالے کر دیا۔

پروفیسر صاحب مرحوم کی دعوت پر کابل کے اس دورہ میں دیگر بہت سے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ پاکستان شریعت کونسل کے امیر مولانا فداء الرحمان درخواستی بھی شامل تھے اور ہم دونوں نے اس وقت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود شہیدؒ کی فرمائش پر چند دن کابل میں رکنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس دوران ہماری ملاقاتیں حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولانا محمد نبی محمدیؒ کے علاوہ مولانا نصر اللہ منصور شہیدؒ سے بھی رہیں جو میرے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ احمد شاہ مسعود مرحوم کا کہنا تھا کہ وہ حافظ الحدیث مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کے شاگرد ہیں اور اپنے استاذ زادہ مولانا فداء الرحمان درخواستی کی میزبانی کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال یہ دورہ ہم نے پروفیسر صبغۃ اللہ مجددیؒ کی دعوت پر کیا تھا اور ان کے ساتھ ایک یادگار مشاورت ہوئی تھی۔ مجددی صاحب ایک باوقار اور محترم بزرگ تھے جن کے سب خیالات اور پالیسیوں سے اتفاق ضروری نہیں مگر افغانستان کی ایک بزرگ شخصیت کی وفات ہم سب کے لیے صدمہ کا باعث بنی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۷ فروری ۲۰۱۹ء)

ڈاکٹر عبد القدیر خان مرحوم

محسن پاکستان ڈاکٹر عبد القدیر خان بھی ہم سے رخصت ہو گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ایک ایٹمی سائنسدان کے طور پر انہوں نے وطن عزیز اور عالم اسلام کی جو خدمت کی وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور اس پر انہیں غیروں کے ساتھ ساتھ اپنا کہلانے والوں کی طرف سے کردار کشی اور حوصلہ شکنی کے جن کربناک مراحل سے گزرنا پڑا وہ بھی تاریخ کے ایک سیاہ باب کی صورت میں ہمیشہ یاد رکھا جائے

گا۔ وہ ایک غیور مسلمان اور شعوری پاکستانی تھے اور ان کی زندگی ملت، قوم اور ملک کی مسلسل خدمات سے عبارت ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اسلام، پاکستان اور ملت اسلامیہ کی بات کی اور اس کے لیے اپنی صلاحیتوں کو وقف کیے رکھا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کے عظیم کارنامہ پر دنیا بھر کے مسلمان ان کے شکر گزار اور احسان مند ہیں جس کی ایک چھوٹی سی مثال ان کے حوالہ سے ہم نے کسی کالم میں ذکر کی تھی کہ جب پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر کے خود کو ایٹمی طاقت کے طور پر دنیا میں روشناس کرایا تو مصر کے ایک معروف کالم نویس نے اپنے کالم میں اسرائیل کو ان الفاظ سے مخاطب کیا تھا:

''اسرائیلیو! اب سوچ سمجھ کر بات کرنا، ہم بھی ایٹمی طاقت ہیں۔''

مگر ڈاکٹر عبد القدیر خانؒ کی اس عظیم قومی اور ملی خدمت پر انہیں صحیح مقام دینے کی بجائے جس منفی رویے کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ یقیناً ہماری غلامانہ ذہنیت اور نفسیات کا آئینہ دار ہے۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ چند عالمی اجارہ داروں نے ایٹمی صلاحیت پر اپنا کنٹرول قائم رکھنے اور خاص طور پر مسلم ممالک میں سے کسی کو اس صلاحیت اور توانائی کے قریب نہ آنے دینے کے لیے جو خود ساختہ قوانین وضوابط تشکیل دے رکھے ہیں انہوں نے ان کی پروا کیے بغیر اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے بہرہ ور کرنے اور ایٹمی قوت بنانے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں، اور اس میں وہ اپنی قوم کے ساتھ ساتھ بارگاہ ایزدی میں بھی سرخرو ہوئے۔

ڈاکٹر عبد القدیر خان کی جدائی پر نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ عالم اسلام سوگوار ہے اور ان کی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے ہم سب دعا گو ہیں، آمین یا رب العالمین۔ اس کے ساتھ ہم ڈاکٹر عبد القدیر خان کی آزمائش کے حوالہ سے ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے نومبر ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں شائع ہونے والا اپنا ایک شذرہ بھی شامل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو ہمارے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے:

ڈاکٹر عبد القدیر ہمارے ملک کے محترم سائنس دان ہیں جو اس حوالہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے محسن ہیں کہ انہوں نے پاکستان کو عالم اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اور ان کی اس عظیم محنت کے نتیجے میں آج ہمارے حکمران پاکستان کو ناقابل تسخیر قوت کے طور پر پیش

کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر عالمی دباؤ پر ڈاکٹر عبد القدیر کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے اور خاص طور پر صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے اپنی کتاب میں قوم کے اس محسن کا جس اہانت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے وہ ملی حمیت وغیرت کے تقاضوں کے منافی ہے۔

آج مغربی طاقتیں اور ان کے ہمنوا ممالک ایٹمی اسلحہ پر چند ملکوں کی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے جن خود ساختہ بین الاقوامی قوانین کا سہارا لے رہے ہیں اور جن کے حوالہ سے ڈاکٹر عبد القدیر کو عالمی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دیا جا رہا ہے ہمارے نزدیک وہ قوانین بجائے خود محل نظر اور یکطرفہ ہیں، کیونکہ ایٹمی ہتھیاروں کو صرف چند ملکوں تک محدود کر دینا اور باقی ممالک بالخصوص عالم اسلام کو ان کے حصول سے زبردستی روکنا انصاف اور عدل کے اصولوں کے یکسر خلاف ہے۔ ایٹمی ہتھیار اگر جائز ہیں تو سب کو ان کے حصول کا حق حاصل ہے اور اگر ناجائز ہیں تو سب کے لیے ناجائز ہیں اور دوسرے ممالک کو ایٹمی ہتھیار بنانے سے روکنے والوں کو پہلے اپنے ہتھیار ختم کرنا ہوں گے۔ لیکن ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہمارے حکمران اس سراسر ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے کی بجائے خود اپنے محترم سائنس دان اور قومی ہیرو کی کردار کشی میں مصروف ہیں۔

اس پس منظر میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس محمد اختر شبیر کے یہ ریمارکس قوم کے زخموں پر کسی حد تک مرہم رکھنے کے مترادف ہیں کہ

> ”ہیرو کبھی نہیں مرتے اور ڈاکٹر عبد القدیر نے پاکستان کی جو خدمت کی ہے اس پر ہم ان کے احسان مند ہیں“۔

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۶ء کی رپورٹ کے مطابق مسلم لیگ (ن) لائرز فورم کی جانب سے ایک رٹ کی سماعت کے دوران جسٹس موصوف نے کہا کہ ”ہیرو کبھی مرا نہیں کرتے یہ بھی زندہ رہیں گے اور انہیں عدالتوں کی ضرورت نہیں ہوتی“۔ ہم جسٹس موصوف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے قوم کے جذبات کی ترجمانی کی ` خدا کرے کہ ہمارے حکمران بھی اس حقیقت کا ادراک کر سکیں اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبد القدیر کی کردار کشی سے دست کش ہو جائیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۲ اکتوبر ۲۰۲۱ء)